مجلس ادارت

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰؍روپے — فی شمارہ ۱۲؍روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰؍روپے

دیگر ممالک میں سالانہ — ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر (۲۵، ۴۰)

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر (۹، ۱۴)

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:

حافظ سجاد الٰہی ۲۷؍اے، مال گودام روڈ، لوہا مارکیٹ بادامی باغ، لاہور، پنجاب (پاکستان

Mobile: 3004682752 — Phone: (009242) 7280916 5863609

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، چک بھیجنے کی صورت میں پچاس روپے مزید ارسال کریں، چک یا بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

☆ DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہنچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا، رقم پیشگی آنی چاہیے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

فہرست ششماہی

مضمون نگاران معارف

۱۷۸ ویں جلد

ماہ جولائی ۲۰۰۶ء تا ماہ دسمبر ۲۰۰۶ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست ششماہی

مضامین معارف

۱۷۸ ویں جلد

ماہ جولائی ۲۰۰۶ء تا ماہ دسمبر ۲۰۰۶ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۷۸ ماہ جمادی الاخری ۱۴۲۷ھ مطابق ماہ جولائی ۲۰۰۶ء عدد ۱

فہرست مضامین

email: shibli_academy @ rediffmail.com :ای میل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

اپنے ظلم وستم، اپنی غلطیوں اور زیادتیوں اور اپنے اوپر آنے والے الزام کو دوسروں کے سر منڈھ دینا عیار اور شاطر لوگوں کا شیوہ ہے، اس طرح دولت وقوت اور اقتدار کے متوالے جبر وقہر، تشدد، خوں ریزی اور سفاکی کرکے بھی پاک دامن بنے رہتے ہیں اور سارا الزام مظلوموں، مجبوروں اور کم زوروں کے سر آجاتا ہے اور ظلم واستحصال اور جارحیت کا شکار لوگوں ہی کو ظالم وجارح اور جبر وتشدد پسند قرار دیا جاتا ہے، ظلم وزیادتی کرنے والوں کے رعب ودبدبہ اور خوف سے اکثر لوگوں کا یہ عقیدہ بن جاتا ہے کہ "مستند ہے ان کا فرمایا ہوا" اخبارات اور میڈیا پر بھی زور آوروں کی گرفت ہوتی ہے، اس لیے وہ بھی ان ہی کا راگ الاپتے ہیں، امریکہ سپر پاور ہے، اس کی دہشت گری اور ظلم آرائیوں سے ساری دنیا چیخ رہی ہے، بے گناہوں کو قتل، آبادیوں کو ویرانہ اور ملکوں کو تہ وبالا کرنے کے باوجود اس کے دامن پر نہ داغ دھبہ اور نہ خون کے چھینٹے ہیں بلکہ وہ امن عالم کا علم بردار اور صلح پسند بنتا ہے اور جن ملکوں کو اس نے تاراج کیا ہے، ان کو دہشت گر، جنگ جو، غارت گر اور وحشی کہتا ہے۔

دوسروں کے سر الزام منڈھ دینے میں یہودیوں اور عیسائیوں کو کمال حاصل ہے، اسلام اور مسلمانوں کے علوم وتمدن ان کے اعتراضات کا خاص نشانہ رہے ہیں، وہ اپنی ملمع کاری سے مسلمانوں کی خوش نما چیزوں کو بھی بدنما بنا دیتے ہیں، عیسائیوں نے اپنے اوپر عائد الزام کو بڑی مہارت سے مسلمانوں کے سر ڈال کر اپنے کو بے گناہ اور انہیں قصوروار بنا دیا ہے، اس طرح کا ان کا ایک بڑا الزام یہ تھا کہ اسلام علم دشمن ہے، جب مسلمانوں نے مصر واسکندریہ فتح کیا تو حضرت عمر فاروقؓ کے حکم سے حضرت عمرو بن عاصؓ نے کتابوں کے خزانے کو جلا کر خاک کر دیا، علامہ شبلیؒ نے اپنے مضمون "کتب خانہ اسکندریہ" میں تاریخی تحقیقات سے ثابت کیا کہ مسلمانوں کی فتح کے وقت اسکندریہ میں کسی کتاب خانہ کا کوئی وجود نہ تھا بلکہ اسے بہت پہلے خود عیسائیوں نے برباد کر دیا تھا لیکن چوں کہ یورپ کی تہذیب وشائستگی کے دامن پر یہ ایک نہایت بدنما داغ تھا جس کو مٹانے کے لیے یہ بے اصل قصہ اختراع کیا گیا، اس زمانے میں امریکہ مظالم کرتا اور جارحیت اور دہشت گری کا ارتکاب کرتا ہے مگر اپنی قوت وسطوت سے اپنے الزام کو دوسروں پر تھوپ دیتا ہے، اگر کبھی ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کی واقعی حقیقت

سامنے آئے گی تو معلوم ہوگا کہ یہ اسی کی سازش تھی اور وہی اس پردہ زنگاری کا معشوق تھا۔

یہ لہر اس وقت ہندوستان میں بھی بڑی تیز ہے، یہاں بم دھماکے، دہشت گری، قتل وخوں ریزی اور تخریبی واقعات روز آنہ کا معمول ہو گئے ہیں لیکن ان کا مرتکب خواہ کوئی ہو، الزام پہلے دھلے میں تحقیق وثبوت کے بغیر مسلمانوں ہی کے سر تھوپ دیا جاتا ہے اور میڈیا، ذرائع ابلاغ اور فسطائی جماعتیں نہایت زور شور سے اس طرح اس کو مشتہر کرتی ہیں کہ فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑتے ہیں، اس سے انکار نہیں کہ ہندوستان ہی نہیں ان ملکوں میں بھی جہاں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا ہے بعض پرتشدد واقعات میں مجبور ومظلوم، پرجوش اور جذباتی مسلمانوں کا ہاتھ ہوتا ہے لیکن اس کی وجہ سے ہر پرتشدد واقعہ میں ان کو مجرم بنا دینا اور یہ کہنا کہ مسلمان خوں خوار، جنگ جو، قاتل اور دہشت گر ہوتے ہیں، کسی طرح مناسب نہیں کیوں کہ جب اصل حقائق سامنے آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے اکثر واقعات میں ان کے مخالفین کی سازشیں کارفرما ہوتی ہیں، گجرات میں یہی ہوا اور ۲ر جون کے اخباروں میں جب ناگ پور میں آر ایس ایس کے ہیڈ کوارٹر پر حملے کی خبر ہم نے پڑھی تو اسی وقت خیال ہوا کہ یہ پولس کی من گھڑت کہانی ہے، جس کی تصدیق مہیش بھٹ اور ابو عاصم اعظمی کے بیانات سے بھی ہوئی اور بمبئی ہائی کورٹ کے سابق جج بی جے کولسے پاٹل نے تو یہ کہا ہے کہ سنگھ کے ہیڈ کوارٹر پر حملہ نقلی تھا، اس کی جوڈیشیل انکوائری ہونی چاہیے، بلکہ حالیہ برسوں میں رونما ہونے والے دہشت گری کے بیش تر واقعات نقلی تھے، ان سب کی تحقیقات ہونی چاہیے۔

سہ روزہ "دعوت" دہلی نے اپنی ۱۹ر جون کی اشاعت میں تین واقعات کی قلعی کھولی ہے، سہارا نیوز بیورو کی خبر ۲۳ر مارچ کے مطابق رام پور، مرادآباد اور غازی آباد کے ریلوے اسٹیشنوں کو اڑانے کی دھمکی دینے والا دراصل سارنگ سکسینہ تھا جس نے دھمکی بھرے خط پر سید انور حسن کا نام لکھ کر فوٹو بھی چسپاں کر دیا تھا، ۶ر اپریل کو مہاراشٹر کے شہر ناندیڑ میں لکشمی راو راج کونڈوار کے مکان میں طاقت ور بم کا دھماکا ہوا، دو افراد مارے اور متعدد زخمی ہوئے، پولس پہنچی تو اس مکان سے کچھ نقلی داڑھیاں، نمازی ٹوپیاں، لنگیاں اور کرتے پائجامے برآمد ہوئے، ۱۶ر افراد گرفتار ہوئے مگر جلد ہی ضمانت پر چھوڑ دیے گئے، کچھ مفرور ہیں، ان سب کا تعلق سنگھ سے بتایا جاتا ہے، ۸ر مئی کو

دہلی وکاس پوری کالونی کے یوٹی آئی بینک میں ایک شخص داخل ہوا اور خود کو انسانی بم بتا کر ۴۲ لاکھ لوٹ لیے اور کہا کہ یہ رقم "جہاد" کے لیے ہے، نیز موبائل منھ سے لگا کر کہا "سلیم کیش مل گیا ہے" اس کے ایک پرزے پر انگریزی میں ۷۸۶ اور اللہ از گریٹ لکھا ہوا تھا لیکن بعد میں وہ پکڑا گیا، اس کا نام سندیپ بھٹنا گر ہے، اس کے ساتھی پون گپتا اور رشی پال بھی پکڑ لیے گئے، معاصر نے لکھا ہے کہ یہ کسی طرح اتفاقاً یا حادثتاً روشنی میں آگئے ورنہ حالیہ برسوں میں تشدد اور دہشت گری کے جتنے چھوٹے بڑے واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں تجزیہ کرنے پر ان کی یہی کہانی نظر آئی، ہر چند کہ وہ عوام میں بے نقاب نہیں ہوسکے۔

مسلمانوں کے سر منڈھے جانے والے الزام پر میڈیا اور فرقہ پرست عناصر تو چیختے چلاتے ہی ہیں، ان کے معاملے میں پولس کی "فرض شناسی" بھی بڑھ جاتی ہے اور وہ ذہنی وجسمانی اذیت دے کر بہ زور و زبردستی انہیں اپنا فرضی الزام تسلیم کرنے کے لیے مجبور کرتی ہے، البدر اور لشکر طیبہ وغیرہ جیسی تنظیموں سے ان کا تعلق جوڑ کر جھوٹے اور مضحکہ خیز ثبوتوں کا پلندہ تیار کرتی ہے، جس کے لیے فرقہ پرستوں کی طرف سے اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، ناگ پور کا افسانہ گڑھنے اور دو آدمیوں کو مارنے پر مودی اسے قابل انعام قرار دیتے ہیں لیکن جب اکثریت کے شر پسندوں اور پولس کے علی الرغم مسلمانوں پر عائد کیا جانے والا الزام اکثریت کا نکل آتا ہے اور مسلمان عدالتوں سے بری اور بے قصور ثابت ہو جاتے ہیں تو وہی معاملہ جو اقلیتوں کی نسبت سے سنگین اور ناقابل معافی ہوتا ہے اکثریت کے تعلق سے معمولی اور ہلکا ہو جاتا ہے اور نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور کوئی یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ طویل عرصے تک خواہ مخواہ مسلمانوں کو پھنسانے اور تکلیفیں دینے کے لیے پولس سزا و عقوبت کی مستحق ہے، اسے اتنے اختیارات ہیں کہ وہ مقدمے کی نوبت ہی نہیں آنے دیتی، فرضی مڈبھیڑ دکھا کر جب جس کو چاہتی ہے ہلاک کر دیتی ہے، مہاراشٹر میں جہاں کانگریس کی حکومت ہے مسٹر ابو عاصم اعظمی کا دعوا ہے کہ پولس کی جانب سے کیے گئے ۹۰ فیصد انکاونٹر فرضی ہیں، تمام مسلم تنظیموں اور لیڈروں کا فرض ہے کہ وہ حکومتوں سے ان دونوں طرح کے معاملات کی غیر جانب دارانہ تحقیقات کا پرزور مطالبہ کریں تاکہ مظلوموں کو انصاف ملے۔ جمعیۃ علمائے ہند اور انڈین مسلم لیگ نے اس کا مطالبہ کیا بھی ہے۔

☆☆☆

مقالات

زلزلوں کا اسلامی فلسفہ اور ابن عباسؓ کی حدیث کی سائنسی اہمیت

از:- مولانا انیس الرحمن ندوی☆

(۳)

پہاڑوں کی تشکیل اور اس کا فلسفہ اس چٹانی پرت یا چٹانی گولہ کے اثبات کے بعد اب ہم حدیث کے اس ٹکڑے کی پہلی کڑی کی طرف لوٹتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ اس کوہ قاف کی جڑیں اسی چٹانی پرت پر قائم ہیں، دراصل حدیث کے اس چھوٹے سے بیان میں ایک اور عظیم جیولوجیائی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے پہاڑوں کی تشکیل اور اس کا فلسفہ۔

دراصل پہاڑوں کی تشکیل میں اس چٹانی پرت کا بلاواسطہ direct کردار ہوتا ہے، چوں کہ یہ کرۂ حجری تقریباً تیس چھوٹی بڑی ساختمانی تختیوں میں بنٹا ہوا ہے جو اس کے نیچے واقع کرۂ آتشیں پر مستقل تیر رہے ہیں لہذا ہماری زمین پر واقع اکثر پہاڑی سلسلوں کی تشکیل ان ہی ساختمانی تختیوں کے دوران حرکت آپس میں ٹکرانے اور ان کے ایک دوسرے پر چڑھ آنے کی وجہ سے ہوئی ہے، جو آپس میں ٹکرا کر ایک دوسرے پر اس قدر چڑھ آئے ہیں کہ وہ سطح زمین سے بلند ہو کر پہاڑوں کی شکل میں رونما ہوگئے ہیں، اس کا سائنسی ثبوت یہ ہے کہ ہمارے اکثر پہاڑ ان ساختمانی تختیوں کے کناروں یا سرحدوں پر واقع ہیں جہاں ان ساختمانی تختیوں میں تصادم برپا ہوتا ہے، اسی طرح یہ پہاڑ جن چٹانوں پر مشتمل ہیں وہ دراصل کرۂ حجری یا ساختمانی تختیوں کے چٹانی مواد

☆ رفیق، فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور ۲۹۔

ہی پر مشتمل ہیں، لہذا ان پہاڑوں کا بلاواسطہ ربط و تعلق ان ساختمانی تختیوں سے قائم ہوجاتا ہے یا دوسرے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ پہاڑ دراصل ان ہی ساختمانی تختیوں پر قائم ہیں، لہذا حدیث شریف کا یہ بیان کہ اس پہاڑ (کوہ قاف) کی جڑیں اس چٹان میں قائم ہیں، اس سے ایک اعجازی معنویت و مصداقیت کھل کر سامنے آرہی ہے۔

روئے زمین پر دراصل کئی قسم کے پہاڑ پائے جاتے ہیں، ان کی یہ تقسیم ان کے وجود میں آنے اور تشکیل پانے کے طریقہ کار کو بنیاد بنا کر کی گئی ہے، لہذا ان پہاڑوں کی کل چار اقسام ہیں:

۱-تہہ دار پہاڑ: Fold Mountains ۲-تودہ نما پہاڑ: Block Mountains
۳-قبہ دار پہاڑ: Dome Mountains ۴-آتش فشانی پہاڑ: Volcanic Mountains

تہہ دار پہاڑ دو ساختمانی تختیوں کے آپس میں ٹکرانے کے سبب ان کے کناروں کے ٹیڑھا ہوکر باہر نکل آنے کی وجہ سے تشکیل پاتے ہیں۔

Fold mountains, such as the Appalachian mountains in the eastern United State and the Alps in Europe, form when two plates meet head-on and their edges crumple. (۱)

"تہہ دار پہاڑ، جیسے کہ مشرقی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے اپالیچین پہاڑ اور یوروپ کے آلپ پہاڑ، دو ساختمانی تختیوں کے آپس میں ٹکرا کر ان کے کناروں کے خم دار ہونے کی وجہ سے تشکیل پاتے ہیں"۔

تودہ نما پہاڑ Block Mountains رخنہ دار جیولوجیائی منطقوں fault regions میں قشر ارض کی چٹانوں کے سطح زمین سے اوپر کھنچ آنے کی وجہ سے تشکیل پاتے ہیں، مثلاً کیلی فورنیا کے سیرے نویڈا Sierra Nevade پہاڑ، سطی مشرقی افریقہ کے روینزوری Ruwenzori پہاڑ اور جرمنی کے ہرز Harz پہاڑ وغیرہ۔

Fault-Block Mountains consists of blocks of the earth's crust that have been tilted or pushed up along a fracture line called a fault.(۲)

قبہ نما پہاڑ اس وقت تشکیل پاتے ہیں جب جیولوجیائی عوامل قشر ارض کو ورم یا قبہ کی شکل میں اوپر اٹھاتے ہیں، جیسے کہ جنوبی ڈکوٹا کے سیاہ پہاڑ Black Hills اور شمال مشرقی انگلستان کا لیک ضلع Lake District:

Dome mountain, such as the Black Hills of South Dakota and, on a smaller scale, the Lake District in northern England, form where geologic forces lift the earth's crust into a broad bulge or dome. (۳)
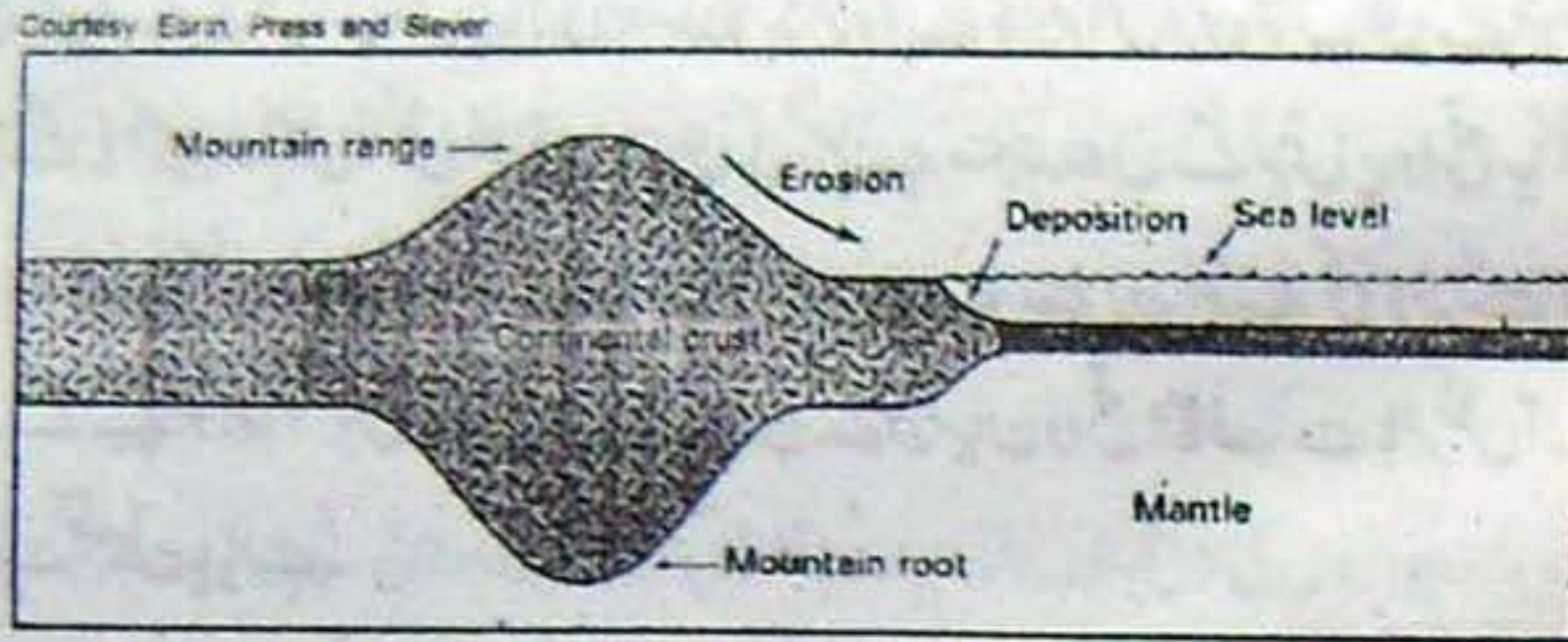
شکل ۷: پہاڑوں کی جڑوں کی ایک سادہ مثال، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً تمام پہاڑوں کی جڑیں قشر ارض crust اور غلاف ارض mantle کی اوپری پرت میں پیوست ہیں جس کو کرۂ حجری lithosphere کہا جاتا ہے۔

پہاڑوں کی ان مختلف اقسام میں ہمیں جو چیز قدرے مشترک اور ان تمام میں یکساں اہمیت کی حامل نظر آتی ہے وہ یہ کہ ان پہاڑوں کا بلاواسطہ ربط و تعلق اس چٹانی پرت یا کرۂ حجری lithosphere سے ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ روئے زمین پر نظر آنے والے تمام پہاڑ دراصل اسی چٹانی گولے پر قائم ہیں یا یہ کہ ان کی جڑیں اس میں پیوست ہیں جس کا اشارہ مذکورہ بالا حدیث شریف کے مختصر سے ٹکڑے سے بہ خوبی مل رہا ہے بلکہ ان تمام اقسام کے پہاڑوں کا مادہ بھی دراصل قشر ارض اور کرۂ حجری میں موجود مختلف قسم کے چٹانی مواد ہی پر مشتمل ہے۔(۴)

آتش فشاں پہاڑ اور ان کی ماہیت

پہاڑوں کی چوتھی اور آخری قسم آتش فشانی پہاڑوں volcanic mountains کی ہے، یہ پہاڑ سطح زمین کے کافی نیچے موجود چٹانوں کے پگھل کر

لاوا کی شکل میں زمین پر امنڈ آنے اور سطح زمین یا سمندری فرش پر ڈھیر ہو جانے کی وجہ سے تشکیل پاتے ہیں، مثلاً اٹلی کا اینا پہاڑ Mount Etna اور وسویس پہاڑ Mount Vesuvius اور جاپان کا فوجی پہاڑ Mount Fuji وغیرہ۔

Volcanic mountains, such as Italy's Mount Etna and Vesuvius, and Japan's Mount Fuji, form when molten rock from deep within the earth erupts and piles up on the surface.
deep within the earth erupts and piles up on the surface.(۵)

سمندری ریڑھ oceanic ridge یا ہماری تحقیق کے مطابق کوہ قاف (لہذا اس مضمون میں آگے جہاں بھی اس پہاڑی سلسلہ کا تذکرہ آئے گا ہم اس کو کوہ قاف ہی سے موسوم کریں گے) بھی دراصل آتش فشانی پہاڑ ہی کی قسم ہے، سمندروں کے فرش پر واقع یہ عظیم پہاڑی سلسلہ دراصل دو ساختمانی تختیوں کے ایک دوسرے سے دور ہونے کی وجہ سے ان چٹانوں کے نیچے موجود آتشیں چٹانی لاوے کے ان کے درمیان واقع شگاف سے باہر نکل آنے کی وجہ سے تشکیل پایا ہے۔

Oceanic ridges from where two crustal plates are moving apart and molten rock wells up from the mantle to fill the gap.(۶)

کوہ قاف کے پہاڑی سلسلہ کا ایک اہم جیولوجیائی انکشاف یہ ہے کہ یہ پورا پہاڑی سلسلہ کم کثیف اور نسبتاً اونچا ہے لہذا اس پہاڑی سلسلہ کے نیچے واقع کرۂ حجری کا حصہ بھی جو اس پہاڑی سلسلہ کو اٹھائے ہوئے ہے وہ بھی اسی قدر کم کثیف ہے، اس توازن کو جیولوجیائی اصطلاح میں ہم توازنی تعادل isostatic equilibrium کہتے ہیں:

Gravity measurements show that meduoceanic ridge is in isostatic equilibiium -i.e., its height above the seabed must be held up by lighter material below.(۷)

" قوت کشش کی پیمائشوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وسط سمندری ریڑھ ہم توازنی تعادلی حالت میں ہے، یعنی کہ سمندر کے فرش پر اس کی بلندی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے نیچے واقع مادہ بھی ہلکا ہو"۔

These rudges are high because they are less dence than the surrounding material. Over the surface of the ocean gravitational attraction varies very little, despite the varying depth of water below, demonstrating nearly perfect isostatic compensation. The ridges must, therefore, be supported on rock that is less dense, although this has much the same chemical composition as the rock on either side .(۸)

" یہ ریڑھیں اونچی اس لیے ہیں کہ وہ اپنے اردگرد کے مادہ سے کم کثیف ہیں، سمندر کے فرش پر قوت کشش کی جاذبیت میں باوجود سمندروں کی گہرائیوں کے اختلاف کے بہت کم اختلاف پایا جاتا ہے، جس سے ایک مکمل ہم توازنی تعادل کا اظہار ہوتا ہے، لہذا ان ریڑھوں کا سہارا نسبتاً کم کثیف چٹانوں پر ہونا ضروری ہے، گو کہ ان ریڑھوں کے کیمیاوی اجزائے ترکیبی بھی ان ریڑھوں کے دونوں طرف واقع چٹان ہی کے اجزائے ترکیبی پر مشتمل ہیں"۔

پہاڑوں کی ان مختلف اقسام اور بالخصوص کوہ قاف اور اس کے ہمارے کرۂ حجری سے اس قدر ربط و تعلق سے یہ حقیقت نمایاں طور پر سامنے آتی ہے کہ یہ پہاڑ اس کرۂ حجری میں پیوست ہیں جس کو اس حدیث شریف میں ایک انوکھے انداز میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ: " اس پہاڑ کی جڑیں اس چٹانی کرہ (کرۂ حجری) میں پیوست ہیں"۔

کوہ قاف کی جیولوجیائی اہمیت

اب آئیے مذکورہ بالا حدیث کے اگلے ٹکڑے کی طرف جس میں اس کوہ قاف کی جیولوجیائی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے اس کی کارفرمائیوں کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے کہ یہ پہاڑ صرف کمیت ہی میں عظیم اور ہیبت ناک نہیں ہے بلکہ وہ کیفیت کے اعتبار سے بھی انتہائی خوف ناک اور پر ہیبت ہے، حدیث شریف کا یہ انکشاف اب تک پیش کیے گئے تمام جیولوجیائی حقائق وانکشافات سے عظیم تر ہے، حدیث شریف کا یہ انکشاف زلزلوں کے فلسفہ اور اس کے واقع ہونے کے اسباب ومحرکات سے متعلق ہے، یہ ایسی جیولوجیائی حقیقت ہے جس کی کنہ وحقیقت تک پہنچتے پہنچتے علم طبقات الارض کو صدیاں لگ گئیں، لہذا اس حدیث شریف کا اگلا ٹکڑا ہے:

فإذا أراد الله أن یزلزل قریة — جب اللہ تعالیٰ کسی قریہ (منطقہ) میں زلزلہ
أمر ذلک الجبل فیحرک العرق — لانا چاہتا ہے تو وہ اس پہاڑ کو حکم دیتا ہے،
الذی یلی تلک القریة — لہٰذا وہ (پہاڑ) اپنی اس جڑ کو ہلاتا ہے جو
اس منطقے کے نیچے ہے۔

حدیث شریف کا مذکورہ بالا بیان ظاہری اعتبار سے غیر عقلی اور غیر سائنسی نظر آرہا ہے کہ آخر زلزلوں کے آنے اور کوہ قاف میں کیا ربط و تعلق ہوسکتا ہے؟ یا یہ کہ زلزلوں کے آنے کا انحصار صرف اسی پہاڑ پر کیوں ہے؟ علامہ آلوسی نے بھی اسی کو بنیاد بنا کر (جیسا کہ اس کی تفصیل گزر چکی ہے) اس حدیث کو درایتی اعتبار سے کم زور گردانا تھا۔

زلزلوں کا فلسفہ اس سلسلے میں علم طبقات الارض کی جونئی تحقیقات آرہی ہیں وہ انتہائی دل چسپ ہونے کے ساتھ ساتھ حیران و ششدر کن بھی ہیں جن کا رخ یقیناً حدیث شریف کی اس عظیم ترین علمی حقیقت کے اثبات کی طرف ہے، لہٰذا علم طبقات الارض اور علم زلزلیات seisemology نے اس سلسلے میں کئی ایک اہم دلائل فراہم کردیے جن سے حدیث شریف کے اس ٹکڑے کی صداقت ثابت ہوتی ہے۔

روئے زمین پر پائے جانے والے پہاڑوں اور پہاڑی سلسلوں سے متعلق سب سے اہم علمی حقیقت یہ ہے کہ تقریباً تمام پہاڑ ساختمانی تختیوں کی سرحدوں پر واقع ہیں جس کی سائنسی توجیہ یہ ہے کہ یہ پہاڑ یا تو ان ساختمانی تختیوں کے آپس میں ٹکرانے کی وجہ سے وجود میں آئے یا ایک دوسرے سے دور بھاگنے کی وجہ سے ان کے درمیان پیدا ہونے والے شگاف سے تحت الارضی لاوے کے پھوٹ پڑنے کی وجہ سے تشکیل پائے ہیں، جیسا کہ اس کی تفصیل گزر چکی ہے، کوہ قاف چوں کہ ایک آتش فشانی پہاڑی سلسلہ ہے، اس لیے اس کا محل وقوع سمندروں میں ایسی جگہوں پر ہے جہاں جہاں کہ سمندروں میں ان ساختمانی تختیوں کی سرحدیں ملتی ہیں، لہٰذا کوہ قاف چوں کہ اپنی وسعت میں 80,000 کلومیٹر سے زائد ہے اور تمام سمندروں کو گھیرے ہوئے ہے، اس لیے وہ تقریباً تمام ساختمانی تختیوں سے ہوکر گزرا ہے (ملاحظہ ہو شکل نمبر ۲ اور شکل نمبر ۵ کا تقابلی مشاہدہ)، لہٰذا کسی بھی ساختمانی تختی کی حرکت، دراڑ یا رخنہ کی وجہ سے جب کوئی بھی زلزلہ آتا ہے تو کوہ قاف

کے اس حصہ کا متزلزل ہونا ضروری ہے جو اس ساختمانی تختی کا حصہ ہے، لہٰذا یہ حدیث شریف کے اس بیان کو تقویت پہنچاتا ہے کہ ان زلزلوں کا سبب یہی کوہ قاف ہو، زلزلوں اور کوہ قاف کے درمیان ربط و تعلق کا یہ پہلا بالواسطہ ثبوت ہوا۔

اس سلسلے کی دوسری جیولوجیائی حقیقت جو اس سے بھی زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ روئے زمین پر اکثر (۹۹٪ سے بھی زائد) زلزلے کوہ قاف اور دوسرے پہاڑی سلسلوں کے محور ہی میں واقع ہوتے ہیں (ملاحظہ ہو شکل نمبر ۴ اور شکل نمبر ۵ کا تقابلی مشاہدہ)، لہٰذا ایسے علاقے جو زلزلوں سے بار ہا متاثر ہوتے ہیں یا زلزلوں کے آنے کا سبب اور محرک بنتے ہیں، ان علاقوں کو علم طبقات الارض کی اصطلاح میں فعال جیولوجیائی خطے geologically active areas کہا جاتا ہے:

Earthquakes occur in geologically active areas of the earth's crust such as midoceanic ridges and mountain-building region. (۹)

" زلزلے قشر ارض کے فعال جیولوجیائی منطقوں میں واقع ہوتے ہیں، جیسے کہ وسط سمندری ریڑھ (کوہ قاف) اور کوہانی منطقے"۔

سمندری ریڑھ جو اپنی وسعت میں تقریباً 80,000 کلومیٹر ہے وہ پورا سلسلہ کوہ زلزلیاتی طور پر فعال نہیں ہے بلکہ اس کا تقریباً تین چوتھائی حصہ زلزلیاتی طور پر فعال پایا گیا ہے، اس کی تفصیل برٹانیکا میں یوں بیان کی گئی ہے:

Ridges separate the oceans into distinct basins and may or may not be seismically active. The seismically active ridge is approximately 60,000 km (37,000 miles) long and extends down the axis of the entire Atlantic Ocean, passing midway between Africa and Antratica and turning north to the centre of the Indian Ocean, where it branches, the main ridge continuing midway between Australia, New Zeeland and Antartica to cross the east side of the Pacific Basin, running all the way to the mouth of the Gulf of Calofornia. (۱۰)

" ریڑھیں سمندروں کو جداگانہ بیسنوں میں تقسیم کرتی ہیں اور وہ زلزلیاتی طور پر فعال ہو

بھی سکتی ہیں اور نہیں بھی، زلزلیاتی اعتبار سے فعال ریڑھ تقریباً 60,000 کلومیٹر (37,000 میل)
لمبی ہے اور وہ پورے بحر اوقیانوس کے محور تک پھیلی ہوئی ہے جو افریقہ اور انٹارٹیکا کے درمیان
سے گزرتے ہوئے شمال کی جانب بحر ہند کے درمیان سے گزر کر دو حصوں میں تقسیم ہوگئی ہے،
لہذا اصل ریڑھ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور انٹارٹیکا کے درمیان سے گزرتے ہوئے بحر الکاہل کے
مشرقی بیسن کو پار کر کے کیلی فورنیا کے دہانے تک پہنچ گئی ہے"۔

سمندری ریڑھ (کوہِ قاف) کو زلزلیاتی پٹی seismic belt کا حصہ گردانا جاتا ہے،
لہذا انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں زلزلیاتی پٹی کی تعریف یوں کی گئی ہے:

Seismic Belt: Narrow zone on the Earth's surface along which most of the world's seismic activity occurs. If the lithosphere is thought of as made up of several large plates, the edges where these plates move against one another would represent the world's seismic belt.(۱۱)

"زلزلیاتی پٹی: سطح زمین پر واقع تنگ منطقہ ہے جہاں پر دنیا کی اکثر زلزلیاتی سرگرمیاں
رونما ہوتی ہیں، اگر کرۂ حجری کو یوں تصور کیا جاتا ہے کہ وہ متعدد بڑی تختیوں سے بنا ہوا ہے تو وہ
کنارے (ساختمانی تختیوں کی سرحدیں) جہاں یہ تختیاں ایک دوسرے کے خلاف حرکت پذیر
ہوتی ہیں، زلزلیاتی پٹی کی نمایندگی کرتے ہیں، قوسی جزائر، پہاڑی سلسلے، آتش فشانیت، گہرے
سمندری حوض اور زلزلیاتی سرگرمی اس زلزلیاتی پٹی کی خصوصیات ہیں"۔

سمندروں میں وہ منطقے جہاں کہ کرۂ حجری کی ساختمانی تختیوں کی سرحدیں واقع ہیں
وہی کوہِ قاف (سمندری ریڑھ) کا محل وقوع ہیں، لہذا انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا نے اس کی تفصیل
ایک دوسری جگہ اس طرح کی ہے:

Today there are more than 1,000 seismograph station around the world, and their data are used to compile seismicity maps. these maps show that earthquake epicentres are aligned in narrow, continuous belts along the boundaries of lithospheric plates. The earthquake foci outline the mid-oceanic ridge in the Atlantic,

Pacific, and Indian oceans where the plates separate ..... (۱۲)

"آج دنیا بھر میں تقریباً ایک ہزار سے زائد زلزلہ پیما مراکز قائم ہیں، ان کی معلومات اور
اعداد و شمار کو زلزلیاتی نقشوں کی تدوین کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، یہ نقشے دکھاتے ہیں کہ زلزلوں
کے مراکز epicentres کرۂ حجری کی ساختمانی تختیوں کے کناروں پر واقع تنگ اور سلسلہ دار
پٹیوں کے شانہ بہ شانہ ہیں، زلزلوں کا نقطۂ ارتکاز بحر اوقیانوس، بحر الکاہل اور بحر ہند میں واقع وسط
سمندری ریڑھ کی غمازی کرتا ہے جہاں پر کہ ساختمانی تختیاں جدا ہوتی ہیں"۔

اس سلسلے میں برٹانیکا کا ایک اور بیان ملاحظہ ہو جس کے مطابق صرف اور صرف کوہِ
قاف کا پہاڑی سلسلہ ہی زلزلیاتی اعتبار سے فعال ثابت ہوا ہے:

The most important question is wether or not a ridge is active, that is, wether earthquakes occur along its axis. This distinction, combined with bathymetry, or the delineation of submarine topography, suffices to provide a classification that is confirmed by other geophysical and geological properties. Only the midoceanic ridge system and the island arcs of the world are active; all others are aseismic or quiescent.(۱۳)

"سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ایک ریڑھ ridge فعال ہوتی ہے یا نہیں؟ یعنی کہ کیا
زلزلے اس ریڑھ کے محور میں واقع ہوتے ہیں یا نہیں؟ یہ وصف، عمق پیمائی یا آب دوزی
جغرافیہ نگاری کی تصویر کشی کی مدد سے ایک ایسی درجہ بندی کے متعلق کافی وشافی مواد فراہم کر چکا
ہے جس کی تائید علم طبیعیات الارض اور علم طبقات الارض کے دوسرے خصائص نے بھی کر دی
ہے کہ صرف اور صرف وسط سمندری ریڑھ اور دنیا کے قوسی جزائر ہی فعال ہیں، ان کے علاوہ تمام
علاقے غیر زلزلیاتی اور غیر متحرک یا ساکن ہیں"۔

مندرجہ بالا بحث سے اس امر کا بخوبی علم ہو گیا کہ علم طبقات الارض کی جدید تحقیقات
اور حدیث شریف کے مندرجہ بالا بیان میں کس قدر زبردست مطابقت اور ہم آہنگی پائی جارہی
ہے، حدیث شریف کے الفاظ کوہِ قاف کو زلزلوں کے پیدا ہونے کا محرک اور عامل اساسی قرار

دے رہے ہیں جب کہ جدید سائنس اور علم طبقات الارض حدیث شریف کے اس بیان کی تصدیق اور اس کا عملی ثبوت یوں فراہم کررہے ہیں کہ روئے زمین پر واقع ہونے والے تقریباً تمام ہی زلزلوں کا نقطۂ آغاز یہی کوہ قاف کا پہاڑی سلسلہ اور اس کا محور ہے۔

یہ بین التختی زلزلوں interplate earthquakes کا حال ہے، جہاں تک داخل تختی زلزلوں intraplate earthquakes کا تعلق ہے جن کا تناسب (جو ایک فیصد سے بھی کم واقع ہوتے ہیں) شدت اور وسعت ان بین التختی زلزلوں کے مقابلے میں انتہائی کم ہے تو ان کے متعلق سائنس دانوں کی دو رائیں ہیں جن میں ایک کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان داخل تختی زلزلوں کے واقع ہونے کا محرک اور سبب بھی دراصل ان ساختمانی تختیوں کی سرحدوں پر واقع پہاڑی سلسلے اور کوہ قاف ہے:

Intraplate earthquakes tend to occur in soft, weak areas of plate interiors. Scientists believe intraplate quakes may be caused by strains put on plate interiors by changes of temperature or pressure in the rock. Or the source of the strain may be a long distance away, at a plate boundary.(۱۴)

"داخل تختی زلزلے ساختمانی تختیوں کے درمیانی حصوں کے ملائم اور کم زور منطقوں میں واقع ہوتے ہیں، سائنس دانوں کا خیال ہے کہ داخل تختی زلزلے ساختمانی تختیوں کے اندرون درجہ حرارت کی تبدیلی یا ان چٹانوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے تناؤ کی وجہ سے واقع ہوتے ہیں یا یہ کہ اس تناؤ کا محرک یہاں سے بہت دور واقع ساختمانی تختی کی سرحد (کوہ قاف کا محور) بھی ہوسکتا ہے"۔

زلزلوں کے محرک اور نقطۂ آغاز سے متعلق مندرجہ بالا بحث و تحقیق سے اس امر کا بخوبی مشاہدہ ہوگیا کہ جدید سائنسی تحقیقات و انکشافات نے زلزلوں کے پیدا ہونے کے سلسلے میں آتش فشانی کوہ قاف کو محرک رئیسی اور عامل اساسی کا درجہ قرار دیا ہے، کوہ قاف کے متعلق علم طبقات الارض کی ان تحقیقات سے جہاں اس کے عظیم الجثہ اور دیوہیکل ہونے کا پتہ لگا ہے وہیں اس آتش فشانی پہاڑی سلسلے کی ہیبت ناکی بھی ظاہر ہورہی ہے، اس طرح جدید سائنسی تحقیقات

نے کمیت و کیفیت دونوں میں کوہ قاف اور اس کی جیولوجیائی اہمیت کے متعلق حدیث شریف کے ہمہ جہتی بیانات کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے، کیا صرف یہ ایک حقیقت ہی اسلام کے فلسفہ کائنات اور اس کی ابدیت و آفاقیت کو ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں؟۔

جہاں تک علامہ آلوسی کے اس بیان کا تعلق ہے کہ زلزلوں کا ورود سطح زمین کے نیچے حرارت اور بھاپوں کے جماؤ اور ان کے سطح زمین کی طرف نکلنے کی سعی و جہد کی وجہ سے ہوتا ہے تو جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ یہ زلزلوں کے واقع ہونے کے اسباب میں سے ایک سبب ضرور ہے جو آج بھی سائنسی بنیادوں پر ایک صحیح نظریہ شمار کیا جاتا ہے، یہ عموماً داخل تختی زلزلوں کے واقع ہونے کا محرک بنتا ہے، جیسا کہ ورلڈ بک انسائیکلوپیڈیا کے سابقہ بیان (ملاحظہ ہو حوالہ ۱۳) سے معلوم ہورہا ہے۔

جدید علم طبقات الارض کا بانی: ابن سینا

زلزلوں کے واقع ہونے کے اسباب سے متعلق علامہ آلوسی کا یہ بیان دراصل ابن سینا کی تحقیق ہے (۱۵) جو وہی عظیم طبیب، ریاضی دان، فلسفی اور سائنس داں ابن سینا (م ۱۰۳۷ م) ہے جسے بہت کم لوگ اس معنی میں جانتے ہیں کہ وہ دراصل علم طبقات الارض کا ماہر بلکہ صحیح معنوں میں اس فن کا بانی بھی ہے، ہیئت ارضی landscape، پتھروں، چٹانوں اور پہاڑوں کی تشکیل، زلزلوں کے پیدا ہونے کے اسباب و محرکات، پانی کے مخازن اور ان کے مآخذ، ہیئت ارضی کی تشکیل میں پانی کی روانی اور اس کی کارفرمائیوں اور معدنیات کی تشکیل وغیرہ کے سلسلے میں اس کی آراء ایک ہزار سال سے علمی دنیا پر چھائی رہی ہیں، لہٰذا آج علم طبقات الارض ان ہی بنیادوں پر قائم ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ جدید علم طبقات الارض دراصل ابن سینا کے افکار و نظریات ہی کی توسیعی شکل ہے۔

The Arab philosopher and physicia Avicenna came nearest to the modern view when, nearly 1,000 years ago, he argued that landscapes did change largely as a result of the action of running water. But Avicenna's views were ignored in Europe in the Middle Ages, where scholars influenced by the Christian Church based their explanations of the creation of the Earth on Genesis.(۱۶)

"عرب فلسفی اور طبیب ابن سینا جدید نظریہ کے بالکل قریب پہنچا جب کہ اس نے تقریباً ایک ہزار سال قبل یہ نظریہ پیش کیا کہ ہیئت ارضی میں بڑی تبدیلی پانی کے بہاؤ کی وجہ سے واقع ہوتی ہے مگر ابن سینا کے نظریات کو قرون وسطی کے یوروپ میں نظر انداز کر دیا گیا، کیوں کہ وہاں سائنس داں جو مسیحی کلیسا کے زیر اثر تھے انہوں نے زمین کی تخلیق کے متعلق اپنے نظریات کی بنیاد "پیدایش" کے نظریہ پر رکھی تھی"۔

یوروپ میں علم طبقات الارض کے سلسلے میں بحث و تحقیق کا آغاز اٹھارہویں صدی عیسوی اور اس کے بعد شروع ہوا، اس وقت تک یوروپ میں ہیئت ارضی landscape اور زمین کی جغرافیائی خصوصیات کے متعلق "نظریہ تخلیق" رائج تھا، جس کا مطلب تھا کہ سطح زمین کی جغرافیائی خصوصیات اور ہیئت ارضی آج جس شکل میں ہیں دراصل ان کی تخلیق اسی شکل میں کی گئی ہے اور یہ خصوصیات جامد ہیں، ان میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی سوائے مافوق الطبیعی طاقتوں کی بلاواسطہ کارفرمائی کے۔

Until the mid- eighteenth century, most European scholars believed the flood, and other catastrophes, caused by supernatural forces, were responsible for the only changes in the Earth's landscapes since the Creation 4004 BC. (۱۶)

"اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط تک اکثر یوروپی سائنس دانوں کا خیال تھا کہ طوفان اور دوسری فطری آفتیں جو (بلاواسطہ طور پر) مافوق الفطری طاقتوں کے پیدا کردہ ہوتے ہیں، صرف اور صرف یہی ۴۰۰۴ ء میں اس (زمین) کی تخلیق کے بعد سے ہیئت ارضی میں تبدیلی لانے کے اہل اور ذمہ دار ہیں"۔

یہ بات انتہائی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ اہل مغرب جو ابن سینا کے آٹھ سو سال بعد اس میدان میں وارد ہوئے اور اس کے افکار و نظریات پر جدید علم طبقات الارض کی عمارت کھڑی کی، ابن سینا کو بجائے جدید علم طبقات الارض modern geology کا واضع اور بانی قرار دینے کے اس کے کارناموں کا صرف اس قدر اعتراف کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ "ابن سینا کے نظریات جدید علم طبقات الارض کے نظریات سے قریب تر تھے" اور بعض مغربی مورخین اس

مشکل کو بھی یہ کہہ کر ختم کر دیتے ہیں کہ "ابن سینا کے نظریات کا ماخذ یونانی سائنس تھی" تو ظاہر ہے کہ اس قسم کی علمی تنگ نظری بلکہ فنی اختلاق سے، بجائے حقیقت پسندی کے مغربی ذہنیت کی عکاسی اور نمایندگی ہوتی ہے۔

ساختمانی تختیوں کا اثبات اس معترضہ بحث کے بعد اب حدیث شریف کے آخری ٹکڑے پر بحث کی جاتی ہے، جس میں ضمناً بعض دوسرے اہم جیولوجیائی نظریات کی طرف اشارہ ملتا ہے، لہذا حدیث کے اس آخری ٹکڑے کو سمجھنے کے لیے اس کے سابقہ ٹکڑے کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے جو اس طرح ہے:

امر ذلک الجبل فیحرک العرق الذی یلی تلک القریة فیزلزلها و یحرک فمن ثم تحرکت القریة دون القریة	(اللہ) اس پہاڑ (کوہ قاف) کو حکم دیتا ہے لہذا وہ پہاڑ اس منطقہ کے نیچے واقع اپنی شاخ کو حرکت دیتا ہے تو وہ شاخ اس منطقہ کو حرکت دیتی اور ہلاتی ہے، لہذا دوسرے منطقہ کی بہ نسبت وہ (مخصوص) منطقہ ہلتا ہے۔

حدیث کے اس ٹکڑے میں دراصل ایک اہم ترین جیولوجیائی نظریہ کی طرف اشارہ ہو رہا ہے اور وہ ہے نظریہ ساختمانی تختیاں Theory of plate tectonics اس سلسلے میں اس حدیث شریف کے دو الفاظ انتہائی اہمیت کے حامل ہیں جو "عرق" اور "قریة" ہیں۔

"عرق کے لغوی معنی جڑ کے ہیں جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ کوہ قاف اس قدر وسیع (80,000 کلومیٹر سے زائد لمبا) ہے کہ اس کا وجود تمام ساختمانی تختیوں پر قائم ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ کوہ قاف کی جڑیں تمام ساختمانی تختیوں سے جڑی ہوئی ہیں (ملاحظہ ہو شکل نمبر ۲ اور شکل نمبر ۵ کا تقابلی مشاہدہ، شکل نمبر ۲ میں ساختمانی تختیوں کی سرحدوں کی نشان دہی کی گئی ہے جب کہ شکل نمبر ۵ میں کوہ قاف کے محل وقوع کی اور سمندر میں کوہ قاف کا محل وقوع ایسی جگہوں پر ہے جہاں ساختمانی تختیوں کی سرحدیں ہیں)، لہذا کوہ قاف کی کسی جڑ یا علم طبقات الارض کی اصطلاح میں اس کے محور یا شاخ axis میں جنبش کا مطلب اس جڑ سے متعلقہ ساختمانی تختی کی جنبش و حرکت ہے اور ساختمانی تختیوں کی یہی جنبش و حرکت زلزلوں کے آنے کا سبب و محرک بنتی

ہے جس کی تفصیل شروع میں گزر چکی ہے، ساختمانی چٹانوں کی زیر زمین ان حرکات کو سمجھنے کے لیے شکل نمبر ۶ ملاحظہ ہو جس میں ان ساختمانی تختیوں کی مختلف حرکات اور ان کی اقسام کو مختلف تصویروں کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے۔

اس سلسلے کا دوسرا لفظ جو حدیث میں استعمال ہوا ہے وہ ہے ''قریہ''، اس کے معنی گاؤں اور شہر کے آتے ہیں اور چوں کہ اس کا استعمال یہاں زلزلیاتی اور جیولوجیائی سیاق میں ہوا ہے، اس لیے اس کے معنی منطقہ یا علاقے کے بھی ہو سکتے ہیں، کیوں کہ بالعموم جب زلزلہ آتا ہے تو اس سے ایک بڑا منطقہ متاثر ہوتا ہے جو مرکز زلزلہ epicentre کے چاروں طرف زلزلیاتی لہروں seismic waves کی شکل میں دائرہ نما پھیلتا چلا جاتا ہے، لہٰذا یہ زلزلہ زدہ حصہ ایک گاؤں، شہر یا بڑا علاقہ اور منطقہ بھی ہو سکتا ہے، اسی مناسبت سے یہاں قریہ کے معنی منطقہ اور علاقے کے لیے ہیں۔

لہٰذا زلزلوں کی تاثیر طبیعی اور فطری اعتبار سے بجائے عالم گیر ہونے کے اس کے علاقائی یا مقامی local ہونے میں اس حقیقت کا بڑا دخل ہے کہ ہمارا کرۂ حجری lithosphere تقریباً تیس چھوٹی بڑی ٹکڑیوں میں بنتا ہوا ہے جن کو ساختمانی تختیاں کہا جاتا ہے اور حدیث شریف میں مستعمل لفظ ''عرق'' سے اس کی طرف ضمنی طور پر اشارہ ہو رہا ہے، کیوں کہ یہاں بجائے پورے کرۂ حجری کے محض اس کی مخصوص شاخ کی حرکت کا تذکرہ کیا گیا ہے اور چوں کہ کوہ قاف کی جڑیں اس کرۂ حجری میں پیوست ہیں، لہٰذا اس کی کسی مخصوص شاخ کی حرکت سے اس کرۂ حجری میں واقع وہ مخصوص ساختمانی تختی کی حرکت ہوگا جس کا کوہ قاف حصہ ہے، اگر ایسا نہ ہو کر ہمارا کرۂ حجری بالفرض صرف ایک وحدت ہوتا اور پھر کسی طبیعی اور فطری سبب کی وجہ سے اس میں جنبش پیدا ہوتی تو اس سے سطح زمین کا ہر حصہ بیک وقت متاثر ہوتا اور اس سے واقع ہونے والی تباہی کی نوعیت ہمہ گیر اور عالم گیر ہوتی۔

لہٰذا حدیث شریف کے ان دو الفاظ میں دراصل ان ہی دو اہم جیولوجیائی حقائق کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے، یعنی پہلے لفظ ''عرق'' سے ان ساختمانی تختیوں کی طرف اشارہ ہے جب کہ دوسرے لفظ ''قریہ'' سے ان زلزلوں کی عالم گیر تاثیر کے بجائے ان کی علاقائی تاثیر کا

سبب بیان کیا جا رہا ہے۔

مذکورہ بالا حدیث شریف میں ان گوناگوں علمی حقائق و نظریات کے اثبات کے لیے الفاظ اور اسالیب کا انتخاب اور استعمال اس قدر عام فہم اور سادہ انداز میں کیا گیا ہے جو اس حدیث کی علمی و سائنسی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی ادبی اور بلاغتی محاسن اور خوبیوں کی قدر و قیمت کو بھی اجاگر کرتا ہے، پس ان ہمہ جہتی بیانات اور حقائق سے اس بات کا اثبات ہوتا ہے کہ اس قسم کے حقائق کا ماخذ کسی انسان یا انسانوں کی ایک جماعت کا کلام بھی نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ تمام حقائق ایک دوسرے ذریعہ علم - وحی - کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور اس کی صداقت و سچائی پر سائنسی دلائل فراہم کر رہے ہیں۔

کیا زلزلے خدائی عذاب ہیں؟

زلزلوں اور علم طبقات الارض کے متعلق حدیث شریف کے ان ہمہ جہتی بیانات اور اس میں اور جدید جیولوجیائی حقائق و نظریات میں اس قدر حیرت انگیز مطابقت کے بعد اب اس سلسلے کی آخری کڑی پر بحث کی جاتی ہے اور وہ یہ اہم ترین سوال ہے کہ کیا زلزلے اور دوسری زمینی اور آسمانی آفات خدائی عذاب ہوتے ہیں؟ اور اگر ان آفات کو خدائی عذاب سے تعبیر کیا جائے جیسا کہ صراحتاً اسلامی نصوص سے اس کا پتا چلتا ہے تو پھر زلزلوں کی اس سائنسی توجیہ کے ساتھ اس کا ربط و تعلق کیوں کر ہو سکتا ہے؟ یا یہ کہ جب زلزلوں کی فطری اور سائنسی توجیہ ممکن ہے تو پھر ہم اس میں خدا اور اس کی خدائیت کے عمل دخل کو کیوں کر مانیں؟ اور اس کو غیر فطری اسباب اور مافوق الطبیعی عوامل سے کیوں جوڑا جائے؟۔

یہ بظاہر ایک پیچیدہ سوال معلوم ہوتا ہے کیوں کہ یہ بیک وقت زلزلوں کے طبیعی و مافوق الطبیعی دونوں پہلوؤں کے حل کا طلب گار ہے۔ جہاں تک زلزلوں کے طبیعی قوانین اور فطری اسباب و محرکات کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں اسلامی نصوص اور جدید سائنس میں مکمل مطابقت اور ہم آہنگی پائی جا رہی ہے جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، لہٰذا یہ ملحدین اور مادہ پرستوں کو راہ ہدایت دکھانے کے لیے کافی ہے، البتہ ان زلزلوں کے مافوق الطبیعی عوامل کے لیے ہمیں دوبارہ اسلامی نصوص کی طرف رجوع کرنا ہوگا، اس لیے کہ اس کا جواب ہمیں سائنس میں نہیں مل سکتا کیوں کہ سائنس کا موضوع بحث صرف طبیعی و فطری مظاہر و قوانین ہوتے ہیں، مافوق الفطری اور مافوق

الطبیعی عوامل نہیں۔

لہذا اس سلسلے میں سب سے پہلے حضرت ابن عباسؓ کی اسی حدیث کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، چنانچہ اس حدیث میں زلزلوں کے واقع ہونے کے سلسلے میں جو سب سے پہلا سبب بیان کیا گیا ہے وہ ہے خدائی ارادہ اور خدائی حکم (امر):

فإذا أراد الله أن يزلزل قرية أمر ذلك الجبل	جب اللہ تعالیٰ کسی علاقے میں زلزلہ لانا چاہتا ہے تو وہ اس پہاڑ کو حکم دیتا ہے۔

لہذا حدیث کے اس ٹکڑے میں مذکور لفظ "امر" (خدائی حکم) انتہائی اہمیت کا حامل ہے جو ایک سادے سے لفظ سے بڑھ کر ایک خدائی اصطلاح ہے، لہذا اس کی معنوی وسعت میں حکم طبیعی natural law کے ساتھ ساتھ حکم شرعی shariah law دونوں کا استقصا موجود ہے، اسلامی نصوص میں اس لفظ کا استعمال بیک وقت ان دونوں معانی میں ہوا ہے، مثلاً قرآن مجید میں جہاں فطری وطبیعی قوانین کو خدائی احکام "امر" سے تعبیر کیا گیا ہے وہیں شرعی قوانین اور پھر ان کی نافرمانی کی پاداش میں خدائی عذاب وعقاب کو بھی خدائی حکم "امر" سے تعبیر کیا گیا ہے، مثلاً فطری قوانین کے سلسلے میں وارد چند آیات ملاحظہ ہوں:

وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهٖ (اعراف:۵۴)	اور سورج، چاند اور تاروں کو اپنے حکم کے تابع دار بنا کر (پیدا کیا)۔
إِنَّمَا أَمْرُهٗ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (یٰسین:۸۲)	اس کا حکم (قانون) ایسا ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اتنا ہی فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔
وَمِنْ آيَاتِهٖ أَنْ تَقُوْمَ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ بِأَمْرِهٖ (روم:۲۵)	اور اس کی نشانیوں میں سے یہ کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔
وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهٖ (ابراہیم:۳۲)	اور اس نے تمہارے لیے جہاز مسخر کیے تا کہ وہ سمندروں میں اس کے حکم سے چل سکیں۔

مذکورہ بالا آیات میں فطری اور طبیعی قوانین کو خدائی اوامر سے تعبیر کیا گیا ہے کہ دنیا کی

ہر شئی ایک قاعدے اور ایک قانون کی پابند ہے اور وہی قانون خدائی حکم ہے جس سے دنیا کی کوئی بھی شئی منحرف نہیں ہو سکتی، اسی طرح شرعی قوانین اور ان کی نافرمانی کی پاداش میں عذاب الٰہی کو بھی خدائی حکم "امر" سے تعبیر کیا گیا ہے، اس سلسلے میں وارد چند آیات ملاحظہ ہوں:

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ أَمْرِهٖ أَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ (نور:۶۳)	پس جو لوگ اللہ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں ان کو ڈرنا چاہیے کہ ان پر کوئی آفت آجائے یا ان کو کوئی سخت عذاب آگھیرے۔
أَتَاهَا أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيْدًا كَأَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ (یونس:۲۴)	اس پر ہماری طرف سے دن یا رات میں ہمارا حکم (عذاب) آپہنچا تو ہم نے اس کو اس طرح صاف کر دیا گویا کہ کل وہاں کچھ بھی نہ تھا۔
حَتّٰى إِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا (ہود:۴۰)	یہاں تک کہ جب ہمارا حکم (عذاب) پہنچا اور تنور نے جوش مارا ہم نے کہا کشتی میں ہر قسم کے نر مادہ جوڑے چڑھا لے۔
وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ آمَنُوْا مَعَهٗ (ہود:۵۸)	اور جب ہمارا حکم (عذاب) آپہنچا تو ہم نے ہود اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو بچا لیا۔
فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا صَالِحًا وَّالَّذِيْنَ آمَنُوْا مَعَهٗ (ہود:۶۶)	جب ہمارا حکم (عذاب) آپہنچا تو ہم نے صالح اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو نجات دے دی۔
فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ (ہود:۸۲)	جب ہمارا حکم (عذاب) آپکا تو ہم نے وہ بستیاں الٹ ڈالیں اور زمین پر کنکر کے پتھر برسانا شروع کیے جو لگاتار گر رہے تھے۔
وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ آمَنُوْا مَعَهٗ (ہود:۹۴)	جب ہمارا حکم (عذاب) آپہنچا تو ہم نے شعیب اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو بچا لیا۔

خدائی احکام کی جامعیت قرآنی آیات کے اس تجزیے سے اس کا بخوبی مشاہدہ ہو گیا کہ

امر الٰہی (خدائی حکم) امر تکوینی natural law اور امر تشریعی shariah law دونوں کا بہ یک وقت متحمل ہے جو ایک عام لفظ سے بڑھ کر ایک خدائی اصطلاح ہے، لہٰذا فطرت و شریعت دونوں ہی اس جبار و قہار ہستی کے احکام و قوانین کا مجموعہ ہیں، زلزلوں سے متعلق حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ بالا حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خدائی احکام اور سزا و جزا سب فطری قوانین کے تحت صادر ہوتے ہیں، لہٰذا فطری قوانین اور مظاہر فطرت خدائی قوانین اور احکام کی سلسلہ وار کڑیوں میں سے محض ایک کڑی ہیں، ان کا ایک سرا طبیعی اور فطری ہوتا ہے جب کہ دوسرا سرا مافوق الطبیعی اور مافوق الفطری - اور انسان محض اس کے فطری و طبیعی احکام اور قوانین کے جزوی مطالعہ و تحقیق کا اہل بنایا گیا ہے، اس سے آج کل اٹھائے جانے والے اس سوال کا کہ "جب مظاہر فطرت کی طبیعی اور فطری توجیہ ممکن ہے تو پھر اس میں خدا کے عمل دخل کو کیوں کر مانا جائے؟" کا بخوبی رد بھی ہو جاتا ہے اور اس سے اس نظریہ کو بھی تقویت ملتی ہے کہ خدائی نظام شریعت و ہدایت اور خدائی نظام فطرت و طبیعت کے درمیان ربط و ہم آہنگی coordination کا ایک عظیم الشان نظام ضرور موجود ہے جس کے تحت خدائے ذوالجلال اور خدائے جبار و قہار کے طبیعی و مافوق الطبیعی احکام جاری اور صادر ہوتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ کی مرویات کی سائنسی اہمیت

آپ نے دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی مذکورہ بالا حدیث علم طبقات الارض کے سلسلے میں کس قدر جامع ہے، یہ حدیث دراصل حضرت ابن عباسؓ کی ان بے شمار مرویات میں سے ایک ہے جن کا تعلق سائنسی امور سے ہے، حضرت ابن عباسؓ جو رشتہ میں رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی تھے، ان کا شمار کبار مفسرین و محدثین صحابہ میں ہوتا ہے، ان کی مرویات کی کل تعداد تقریباً ۱۶۶۰ بتائی جاتی ہے، کثرت مرویات کے اعتبار سے ان کا شمار صحابہ میں پانچواں ہے، آپ کے حق میں رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی تھی کہ:

اللهم فقهه فی الدین و علمه تاویل القرآن — اے اللہ تو اس (ابن عباس) کو دین کا فہم اور تفسیر میں بصیرت عطا فرما۔

حضرت ابن عباسؓ کے تفسیری اقوال اور مرویات میں ہمیں بہ کثرت ایسی روایات ملتی

ہیں جن کا تعلق جدید سائنس سے ہے، یا یہ کہ سائنسی امور پر کسی بھی صحابی کی بہ نسبت ان کی روایات کی تعداد سب سے زیادہ ہے، لہٰذا فلکیات، طبیعیات، جغرافیہ، علم طبقات الارض، طب، خارج از زمین زندگی extra terrestrial life وغیرہ موضوعات پر ان کی مرویات بہ کثرت پائی جاتی ہیں جن کی جدید علمی و سائنسی تحقیقات و اکتشافات کے پس منظر میں کافی افادیت و اہمیت ہے، لہٰذا آپ کو ایک معنی میں سائنس داں صحابی کا درجہ دیا جاسکتا ہے لیکن ان کے علم کا ماخذ اور نوعیت کسبی نہیں بلکہ وہبی (وحی) تھا، جو ظاہر بات ہے انہوں نے رسول اللہ ﷺ ہی سے سنا ہوگا۔

قرآن اور حدیث دونوں میں سائنسی حقائق و معارف کا تذکرہ اعجازی انداز میں کیا گیا ہے، البتہ ان سے متعلق حقائق و معارف کے بیان میں قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ قرآنی آیات کی بہ نسبت احادیث میں اس طرح کے حقائق و معارف کا ذکر زیادہ صاف و صریح اور کھلے الفاظ میں ملتا ہے جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کی زیر بحث حدیث خود اس پر شاہد ہے، لہٰذا سائنسی علوم و معارف سے متعلق احادیث کو سائنسی نظریات یا مفروضات کے طور پر اپنا کر اس سلسلے میں اس کو سائنسی بحث و تحقیق کا موضوع بھی بنایا جاسکتا ہے اور اس کام کے لیے آج سائنس دانوں اور علما کے درمیان تعاون و اشتراک از حد ضروری ہے، قرون وسطیٰ (مسلم دور) میں دین اور دنیا کی اسی جامعیت کے تصور ہی کی بہ دولت جدید تجرباتی سائنس کی داغ بیل پڑی اور اس کی ترویج و ترقی میں اس نے عظیم الشان اور تاریخی کردار نبھایا، اس کا ایک تاریخی ثبوت یہی ہے کہ آج جدید سائنس کا کوئی بھی پہلو یا نظریہ ایسا نہیں ہے جس کا بلا واسطہ یا بالواسطہ تعلق مسلم دور کی تحقیقات اور مسلمان سائنس داں کے اس میدان میں کارہائے نمایاں سے نہ ہو، اس بات کو حقیقت پسند مغربی مورخین نے بھی قبول کیا ہے اور مسلمانوں میں بحث و تحقیق اور تجربیت کی روح پھونکنے والے اور انہیں صحیح نظریاتی رہنمائی فراہم کرنے والے قرآن اور حدیث تھے، بلکہ صحیح معنوں میں آج بھی یہ ہمیں نئے میدانوں کو سر کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔

حدیث نبوی کا پیغام

زیر بحث حدیث شریف کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ حضرت ابن عباسؓ کی اس حدیث کی کس قدر جیولوجیائی اہمیت ہے، علم طبقات الارض کی

جدید ترین تحقیقات نے اس کے ان ہمہ جہتی بیانات میں سے ایک ایک بیان پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے، اس سے جہاں احادیث نبویہ کا علمی اعجاز ثابت ہورہا ہے وہیں اس سے اس بات کا اثبات بھی ہوتا ہے کہ قرآن ہی کی طرح حدیث نبوی کا ماخذ بھی وحی الٰہی ہے۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (نجم: ۳-۴) وہ اپنی نفسانی خواہش کے مطابق کچھ نہیں کہتا، بلکہ وہ تو وحی ہے جو اس پر آتی ہے۔

جس طرح کہ ایک طاقت ور زلزلے میں آٹم بموں سے 10,000 گنا زائد توانائی خارج ہوتی ہے اور اس سے انسان کی بنائے ہوئے عالی شان عمارتیں، محلات اور آثار ملیا میٹ ہوجاتے ہیں اسی طرح اس حدیث شریف میں بھی اس قدر طاقت ور علمی مواد ہے کہ اس سے بھی انسان کے باطل مادی افکار ونظریات کی عمارتیں اسی طرح ڈھ جاتی ہیں اور تباہ وبرباد ہوجاتی ہیں، اس سے جہاں ہمارے پورے ذخیرۂ حدیث، علم حدیث، اصول حدیث اور راویان حدیث کی صحت وصداقت پر سائنسی دلائل فراہم ہورہے ہیں، وہیں اس سے باطل مادی افکار ونظریات کی تردید، ختم نبوت کا اثبات، انکار حدیث کا بطلان اور اس قسم کے دوسرے تمام اوہام وخرافات کا ازالہ بھی ہوجاتا ہے۔

لہٰذا اسلامی نصوص میں حدیث نبوی کی حیثیت ایک بنیادی ماخذ کی سی ہے، بلکہ تشریعیات وتکوینیات دونوں میں اس کی قدر وقیمت کسی بھی طرح قرآنی نصوص سے کم نہیں ہے، اگرچہ اس سلسلے میں اولیت قرآن ہی کو حاصل ہے، اسی وجہ سے حدیث نبوی کو رسول اللہ ﷺ نے ایک جگہ قرآن کے ہم مثل قرار دیا ہے:

ألا إني أوتيت الكتاب ومثله معه (۱۸) سن لو! مجھے کتاب (قرآن مجید) اور اس کے ساتھ اس کا ہم مثل (حدیث) بھی عطا کیا گیا ہے۔

ایک اور حدیث میں حدیث نبوی کے معارف کو قرآنی معارف کے ہم مثل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے قرآن سے زائد ہونے کا بھی ذکر ملتا ہے۔

أيحسب أحدكم متكئا على كیا تم میں سے کوئی اپنی آرام کرسی پر لیٹے

أريكته أن الله لم يحرم شيئا إلا ما في هذا القرآن ألا وإني والله قد أمرت ووعظت ونهيت عن أشياء إنها كمثل القرآن أو أكثر۔ (۱۹) ہوئے یہ سوچتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ حرام کیا ہے وہ صرف قرآن میں حرام کیا ہے تو یہ خدا سن لو! میں نے بھی بعض چیزوں کا (تمہیں) حکم دیا ہے اور نصیحت کی ہے اور بعض چیزوں سے روکا ہے، بے شک یہ (حدیث نبوی) قرآن ہی کے ہم مثل ہے یا اس سے بھی زیادہ۔

تشریعیات میں حدیث نبوی کا قرآن کے ہم مثل یا زائد ہونے کا ثبوت تو ثابت ہے ہی، اب تکوینیات میں بھی اس کا ثبوت فراہم ہورہا ہے اور اس کا اثبات بھی ایک قول صحابی (حدیث موقوف) سے اس قدر طاقت ور انداز میں ہورہا ہے، لہٰذا احادیث نبوی کی یہ اضافیات یا زوائد کبھی کسی قرآنی اجمال کی تفصیل بیان کرتے ہیں تو کبھی اس کے غموض کی تشریح اور بعض جگہوں پر وہ اپنے آپ میں نئے نئے حقائق ومعارف اعجازی انداز میں اجاگر کرتے دکھائی دیتے ہیں، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث اس پر شاہد ہے۔

احادیث کو جانچنے کا نیا اصول

جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی اس حدیث کو بعض محدثین نے روایتی اعتبار سے ضعیف اور کمزور قرار دیا ہے جب کہ تحقیقات جدیدہ کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ یہ حدیث درایتی اعتبار سے قوی اور مضبوط ترین ہونے کے ساتھ ساتھ اعجازی معنویت ومصداقیت کے اعتبار سے انتہائی اہمیت کی حامل ہے اور اس حدیث شریف سے ان جیولوجیائی حقائق کا اثبات ہورہا ہے جو ماضی قریب کی یعنی بیسویں صدی کے نصف آخر کی ہیں اور وہ بھی ایک صحابی کی زبان سے، لہٰذا اصولی اعتبار سے اس میں اب کسی قسم کے شبہ کی گنجایش نہیں رہی کہ اس کا ماخذ قول رسول ﷺ ہے اور قول رسول ﷺ کا ماخذ وحی الٰہی ہے، اس طرح آج جدید سائنسی تحقیقات وانکشافات نے ہمیں احادیث کی صحت وصداقت کو جانچنے کا ایک نیا اصول بھی فراہم کردیا ہے کہ اگر کسی حدیث میں تاریخی اور روایتی اعتبار سے کسی بھی قسم کا سقم یا ضعف رہ جائے تو درایتی اعتبار سے چھان بین کرکے اس حدیث کے سقم کو دور کیا جاسکتا ہے اور کسی حدیث کو درایتی اعتبار سے چھان بین کرنے کا ایک پیمانہ جدید سائنس بھی ہے، چنانچہ کسی حدیث کا تکوینی

اور ملکوتی حقائق سے متعلق کوئی بیان اگر تحقیقات و انکشافات جدیدہ کے عین مطابق ہو تو اس حدیث شریف کو صحیح شمار کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ اس قسم کے حقائق و معارف کا ماخذ سوائے وحی کے اور کوئی دوسری چیز نہیں ہوسکتی، اس کا بین ثبوت زیر بحث حدیث شریف ہے جو باوجود روایتی ضعف کے درایتی اعتبار سے انتہائی مضبوط اور قوی ترین ہے، احادیث کو درایتی اعتبار سے جانچنے کے اس اصول کی تصدیق خود ایک حدیث نبوی ﷺ سے بھی ہوتی ہے جو اس طرح ہے۔

إذا سمعتم الحديث عني تعرفه قلوبكم وتلين له أشعاركم وأبشاركم وترون أنه منكم قريب فأنا أولاكم به وإذا سمعتم الحديث عني تنكره قلوبكم و تنفر منه أشعاركم وأبشاركم و ترون أنه بعيد منكم فأنا أبعدكم منه (۲۰)

(رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ) جب تم میری حدیث سنو گے تو تمہارے دل اس کو جان لیں گے اور تمہارے شعور اور وجدان اس کی طرف مائل ہوں گے اور تم جان لو گے کہ وہ تم سے قریب تر ہے تو میں ایسی چیز سے زیادہ قریب تر ہوں اور جب تم میری (ایسی) حدیث سنو گے جس کا تمہارے دل انکار کرتے ہوں اور اس سے تمہارے شعور اور وجدان متنفر ہوتے ہوں اور تم جان لو گے کہ وہ چیز تم سے دور ہے تو میں ایسی چیز سے بعید تر ہوں۔

اس حدیث میں احادیث کو درایتی اعتبار سے چھان بین کرنے کے ایک نفسیاتی اصول کے ساتھ ساتھ ایک علمی اور عقلی اصول بھی بیان کیا جارہا ہے کہ اگر حدیث نبوی صحیح ہوگی تو اس سے نفسیاتی طور پر دلوں میں انسیت اور اس کی طرف طبعی میلان پیدا ہوگا اور علمی و عقلی بنیادوں پر ہم اس کو اپنے سے قریب تر اور درست پائیں گے اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہوگا تو اس کا حکم اس کے برخلاف ہوگا، اس طرح مذکورۂ بالا حدیث نبوی احادیث کی درایتی چھان بین کے اس نئے اصول کے سلسلے میں ہماری نظریاتی رہنمائی فرما رہی ہے جب کہ زیر بحث حدیث ابن عباسؓ نے اس کا عملی ثبوت بھی ہمیں فراہم کردیا ہے۔

تکوینی اور ملکوتی حقائق سے متعلق احادیث کے ضعف کا ایک سبب تاریخی اعتبار سے خود درایت حدیث ہی تھی، کیوں کہ اس دور میں اس قسم کے عجائبات و تصورات ناقابل فہم تھے جس

سے لوگوں کے انکار اور تکذیب کا خطرہ تھا، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ ہی کی ایک اور حدیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ "اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ" (طلاق: ۱۲) کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

لو حدثتكم بتفسيرها لكفرتم وكفركم تكذيبكم بها (۲۱)

اگر میں اس آیت کی (ٹھیک ٹھیک) تفسیر بیان کردوں تو تم کفر کر بیٹھو گے اور تمہارا کفر تمہارا اسے جھٹلانا ہوگا۔

مگر آج علم و سائنس کی ترقی کی بنا پر یہ ناقابل فہم عجائبات و تصورات زندہ حقائق میں بدل چکے ہیں بلکہ اس قسم کے حقائق کا مقصد القاصد ہی موجودہ دور کے انسانوں پر اللہ اور اس کے رسول کی حجت پوری کرنا ہے اور ذات باری تعالیٰ اس کی وحدت و الوہیت، اس کی صفات، رسالت و نبوت اور دوسرے اسلامی معتقدات کا علمی و سائنسی اثبات مقصود ہے۔

لہٰذا اس قسم کی احادیث کو جن میں کسی بھی قسم کا روایتی ضعف یا سقم موجود ہو اگر اس کے مندرجات جدید سائنسی تحقیقات کے مطابق ہوں تو ان کو صحیح حدیثوں کے زمرے میں لایا جاسکتا ہے اور یہ ایک بدیہی امر ہے، کیوں کہ اس قسم کے ملکوتی عجائبات کا ماخذ انسانی کلام نہیں ہوسکتا، لہٰذا روایتی اعتبار سے کمزور احادیث کی ایک بڑی تعداد کو اس پیمانے کے مطابق چھان بین کرکے ان سے جدید دور کی ایک کتاب صحیح مرتب کی جاسکتی ہے اور چوں کہ اس قسم کی روایات کی تصدیق ناقابل تردید سائنسی ثبوتوں سے ہورہی ہے، اس لیے ان احادیث کا مقام صحت و صداقت کے اعتبار سے اولین بھی ہوسکتا ہے، کیوں کہ ان کی صداقت پر آج ایک عالم گواہی دے رہا ہے اور اس کے مصدقین کی تعداد کے سامنے حد تواتر کی شرط بھی ہیچ ہے۔

ظاہر ہے کہ احادیث کی چھان بین کا یہ کام راتوں رات نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ احادیث میں تکوینیات کے سلسلے میں بہت سارے بیانات ایسے موجود ہیں جن کو آج بھی ناقابل فہم تصور کیا جاتا ہے (۲۲)، لہٰذا بعید نہیں کہ مستقبل کی سائنسی تحقیقات و انکشافات سے اس سلسلے میں ان احادیث پر بہتر روشنی پڑسکے اور ان احادیث کا اعجاز آنے والے وقت میں ثابت ہو، لہٰذا اس کے لیے ہمیں مستقبل کی تحقیقات کا بھی انتظار کرنا ہوگا۔ (۲۳)

حرف آخر حاصل بحث یہ کہ اسلام علم و حکمت سے پُر ایک علمی اور عقلی مذہب ہے، اس کی دعوت

خرافات اور توہمات پر نہیں بلکہ علمی اور عقلی بنیادوں پر ہے، اس کی تعلیمات (قرآن اور حدیث) میں اسرار و رموز کا ایک ایسا لامتناہی سمندر سمیٹا ہوا ہے جو انسان کو ایک طرف اس کی کم مائیگی اور بے بضاعتی کا احساس دلاتے ہوئے اس کو رجوع الی اللہ کی دعوت دیتا ہے تو دوسری طرف اس سے اس بات کا اثبات ہوتا ہے کہ اسلام ایک برحق دین ہے اور اس کا نزول بھی اسی ہستی کی طرف سے ہوا ہے جس نے اس کائنات کی تخلیق کی ہے اور یہ کہ رسول اللہ ﷺ اس کے آخری پیامبر ہیں۔

مراجع و حواشی

(۱) World Book Encyclopaedia, Vol. 13, P. 666 (۲) حوالہ سابق (۳) حوالہ سابق (۴) حوالہ سابق (۵) حوالہ سابق (۶) The Planet Earth, P.53 (۷) Encyclopaedia Britannica, Vol. 13. P. 473, 1983 (۸) The Planet Earth, P.53 (۹) The Illustrated Reference Book of Earth, James Mitchell, P. 11, Windward, Leicester, 1982 (۱۰) Encyclopaedia Britannica 2001 Deluxe Edition CD-ROM article: Oceanic Ridges (۱۱) Encyclopaedia Britannica 2001 Deluxe Edition CD-ROM, article: Seismic Belt (۱۲) Encyclopaedia Britannica 2001 Deluxe Edition CD-ROM, article: Earth Sciences: Seismology and the Structuer of the Earth (۱۳) Encyclopaedia Britannica, Vol. 13. P. 472, 1983 (۱۴) World Book Encyclopaedia, Vol. 6. P. 37, 1996 (۱۵) علم زلزلیات کی ترقی میں مسلمان علما اور سائنس دانوں کے تاریخی کردار پر بحث راقم کی زیر طبع کتاب "زلزلوں کا اسلامی فلسفہ" میں ملاحظہ ہو (۱۶) The Mind Alive Encyclopaedia: Earth, Edited by: Thomas Brown, P. 13, Marshall Cavendish Ltd, London, 1984 (۱۷) حوالہ سابق (۱۸) احمد بن حنبل وابو داؤد عن المقدام بن معدی کرب بحوالہ کنز العمال، علاء الدین ہندی، ۱/ ۱۷۳، موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۸۹ء (۱۹) حوالہ سابق (۲۰) احمد بن حنبل و ابو یعلی عن ابی اسید او ابی حمید بحوالہ کنز العمال: ۱/ ۱۷۹ (۲۱) تفسیر ابن کثیر: ۳/ ۳۸۵، اسلام اور جدید سائنس، علامہ محمد شہاب الدین ندوی، ص ۱۲۰، فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ بنگلور ۱۹۸۷ء، دوسرا ایڈیشن (۲۲) اس سلسلے میں علامہ جلال الدین سیوطی (م ۱۵۰۵ م) نے فلکیات، علم طبقات الارض اور دوسرے سائنسی موضوعات سے متعلق وارد احادیث کو ایک مجموعہ کی شکل میں مرتب کیا ہے جس کا نام "الہیئۃ السنیۃ" (یعنی "مسنون علم ہیئت") ہے، اس مجموعہ کا نادر و نایاب نسخہ مخطوطہ کی شکل میں جامعہ ازہر کی لائبریری (مخطوطہ نمبر ۳۲۰۱۳۹) میں موجود ہے، دبئی کے ولی عہد شیخ راشد بن مختوم کی مالی اعانت سے اب جامعہ ازہر کے کتب خانہ کے تمام مخطوطات افادہ عام کی خاطر انٹرنیٹ پر مفت میں دست یاب ہیں لہذا اس مخطوطہ کو www.alazharonline.org سے حاصل کیا جا سکتا ہے (۲۳) راقم نے اپنے بعض دوسرے مضامین میں اس قسم کی احادیث پر بحث کی ہے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں نوشت و خواند
اور
علم و تحفظ کتب میں مسلمانوں کی جاں فشانی[۱]

از:- ضیاء الدین اصلاحی

ایک غلط فہمی کا ازالہ عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عرب اسلام سے قبل اور اس کے بعد میں بھی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، اسی لیے ان پڑھ (امی) کہلاتے تھے، خود آنحضرت ﷺ کی بعثت بھی ان عربوں میں ہوئی تھی جو امیین کہلاتے تھے، قرآن مجید میں ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ
رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ
اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ
الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا
مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ
(جمعہ ۶۲:۲)

وہ اللہ ہے جس نے امیوں میں ان ہی کے اندر سے ایک رسول کو بھیجا جو ان پر اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، بے شک اس سے پہلے یہ لوگ کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔

اور خود رسول اکرم ﷺ کو بھی امی کہا گیا ہے، ارشاد ربانی ہے:

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِیِّ
الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ
وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ
(اعراف ۷:۱۵۸)

پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر جو امی نبی ہیں اور جو اللہ اور اس کی باتوں پر ایمان لاتے ہیں اور اس نبی کی پیروی کرو تا کہ تم ہدایت پاؤ۔

اس سے پہلے حضرت موسیٰ کے دوبارہ کوہ سینا پر جانے کا ذکر ہے جب وہ گوسالہ پرستی کے

[۱] یہ مضمون رضا لائبریری رام پور میں "تحفظ مخطوطات" پر ہونے والے سمینار میں پڑھا گیا تھا۔ "ض"

واقعہ کے بعد توبہ کے لیے گئے تھے اور خدا سے دعا کی تھی، ان کی دعا کے جواب میں خدا نے جو کچھ فرمایا، اس میں بھی امی کا لفظ آیا ہے، ارشاد ہے:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِى التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ (اعراف ۷:۱۵۷)

(میں اپنی رحمت کو ان لوگوں کے لیے لکھ رکھوں گا) جو پیروی کریں گے اسی نبی امی رسول کی جسے وہ اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

اس کی بنا پر عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اہل عرب نوشت وخواند سے نا آشنا تھے اور رسول کریم ﷺ ان پڑھ تھے، حالاں کہ یہ بات خلاف واقعہ ہے جیسا کہ بعد میں ظاہر ہوگا کہ نہ صرف آپ کی بعثت کے وقت بلکہ زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ نوشت وخواند سے آشنا تھے لیکن اس سے پہلے یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ آپ ﷺ کو امی اور عربوں کو امیین کہنے کی وجہ کیا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت کے وقت عربوں میں دو طرح کے لوگ تھے، ایک گروہ کو اہل کتاب کہا جاتا تھا، ان میں یہود، نصاریٰ اور مجوس وغیرہ شامل تھے جو کسی پیغمبر کو مانتے تھے اور ان پیغمبروں کو جو کتابیں اور صحیفے دیے گئے تھے، انہیں تسلیم کرتے تھے، ان کے مقابلے میں دوسرا گروہ کتب سماوی سے محروم اور رسول ونبی سے بے خبر تھا، یہ طبقہ پہلے طبقے کے مقابلے میں شدید ضلالت، گم راہی اور کفر وشرک میں مبتلا تھا، اس گروہ کو امیون اس بنا پر کہا جاتا تھا کہ وہ کتاب الٰہی اور پیغمبر سے نا آشنا تھا۔

قرآن مجید نے ان دونوں طبقوں کا ذکر دو متقابل گروہوں کے لحاظ سے کیا ہے، اس کا انداز بیان ہی بتا دیتا ہے کہ "امیین" کا لفظ اہل کتاب کے مقابلے میں آیا ہے اور اس سے ناخواندہ کے بجائے آسمانی کتابوں اور پیغمبروں سے ناواقف اور بے خبر لوگ مراد ہیں، مزید وضاحت کے لیے بعض آیتیں ملاحظہ ہوں:

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا

جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے اور جو امی ہیں، ان سے کہہ دو کہ کیا تم اسلام لے آئے ہو، اگر وہ اسلام لے آئے ہیں تو انہوں نے ہدایت

عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ (آل عمران ۳:۲۰)

پالی اور اگر انہوں نے روگردانی کی تو بس آپ پر تو صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ (بقرہ ۲:۷۸،۷۹)

اور ان (یہودیوں) میں بعض لوگ امی ہیں، یہ سوائے من مانی باتوں کے کتاب کو نہیں جانتے اور صرف گمان سے کام لیتے ہیں، پس ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس ذریعہ سے وہ کچھ پیسے کمالیں، پس جو کچھ ان کے ہاتھوں نے لکھا ہے، اس کی وجہ سے ان کے لیے ہلاکت ہے اور جو کچھ انہوں نے کمایا ہے، اس کی وجہ سے ان کے لیے بربادی ہے۔

پہلی آیت میں امیون کو اہل کتاب کے مقابلے میں ذکر کیا ہے جس سے خود ہی ظاہر ہے کہ جو اہل کتاب نہیں ہیں وہ امیین ہیں نہ کہ نوشت وخواند سے محروم لوگ، دوسری آیت میں اہل کتاب کو بھی امیون اس لیے قرار دیا ہے کہ وہ مدعی اہل کتاب ہو کر بھی کتاب کا علم نہیں رکھتے اور من مانی باتوں کو مانتے اور ظنون واوہام میں گرفتار ہیں، اس طرح گویا ان کا کتاب پر ایمان ہی نہیں، کیوں کہ وہ ایمان لانے کا حق ادا نہیں کر رہے تھے، اس لیے وہ بھی امیین کی صف میں آگئے جو کتاب الٰہی سے بے خبر ہیں، اگر امی سے مراد نوشت وخواند سے عاری لوگ ہوتے تو یہ کیوں کہا جاتا کہ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ اور فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنا پڑھنا جاننے والے کو بھی امیین کہا جا سکتا ہے۔

امیین کی اصطلاح خود یہودیوں کی ہے جو اس زعم کی بنا پر اپنے کو اہل کتاب کہتے تھے کہ

وہ ایک منتخب اور برگزیدہ گروہ ہیں اور جو لوگ کتاب اور رسول سے نا آشنا تھے انہیں امیین کہتے تھے، قرآن مجید نے ایک جگہ خود ان کے حوالے سے اس اصطلاح کی نسبت یہود کی طرف کی ہے:

ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ (آل عمران ۳:۷۵)	یہ اس بنا پر کہ انہوں نے کہا کہ ہم پر امیوں کے معاملے میں کوئی الزام نہیں ہے۔

ڈاکٹر جواد علی رقم طراز ہیں:

"یہود اپنے عرب پڑوسیوں کو امیون کہتے تھے اور اس سے مراد وہ لوگ نہیں تھے جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے، جیسا کہ بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں بلکہ یہود...... سمجھتے تھے کہ چوں کہ خدا نے ان کو وحی، نبوت اور انبیا سے سرفراز کیا ہے، اس لیے یہ ایک منتخب گروہ ہیں، ان کے برخلاف دوسرے لوگ ان چیزوں سے محروم ہیں، اس لیے وہ غربا ہیں"۔(۱)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو بھی محض امی کی وجہ سے ان پڑھ نہیں کہا جاسکتا، اہل علم اور محققین کی ایک جماعت کے خیال میں آپ ﷺ لکھنا جانتے تھے مگر اچھی طرح نہیں جانتے تھے، صلح حدیبیہ میں جب رسول اللہ ﷺ کے لفظ پر قریش نے اعتراض کیا تو حضرت علیؓ جنہوں نے صلح نامہ لکھا تھا، اسے مٹانے کے لیے تیار نہیں ہوئے، اس لیے آپ ﷺ نے وہ نوشتہ خود لے لیا اور اس پر یہ تحریر فرمایا "ھذا ما قاضی محمد بن عبد اللہ"، بخاری میں یہ روایت کتاب الصلح اور کتاب المغازی دو جگہ ہے، موخر الذکر میں ہے کہ آپ ﷺ نے صلح نامہ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور آپ ﷺ اچھا نہیں لکھتے تھے۔(۲)

جو لوگ آپ ﷺ کی امیت کی وجہ سے آپ ﷺ کو نوشت وخواند سے بے بہرہ مانتے ہیں، وہ دو قرآنی آیات بھی پیش کرتے ہیں، پہلی آیت یہ ہے:

وَمَا کُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ کِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ	اور تم اس سے پہلے نہ کسی کتاب کی تلاوت کرتے تھے اور نہ اس کتاب کو اپنے ہاتھ سے

(۱) تاریخ العرب قبل الاسلام، ج ۲، ص ۹۶ بحوالہ چار علمی مقالات از مولانا سعید احمد اکبر آبادی، ص ۵۸

(۲) بخاری کتاب المغازی، باب عمرۃ القضا، ج ۲، ص ۶۱۰۔

الْمُبْطِلُوْنَ (عنکبوت ۲۹:۴۸)	لکھتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو بے شک اہل باطل شک کرتے۔

ظاہر ہے یہاں پر کتاب اور نوشتہ مراد ہی نہیں ہے بلکہ اس سے کتاب الٰہی مراد ہے جس سے آپ ﷺ کی وہ قوم جس میں آپ ﷺ کی بعثت ہوئی تھی ناواقف تھی اور آپ ﷺ بھی نبوت سے پہلے نہ ایسی کتاب کی تلاوت کرتے تھے اور نہ اس کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، یہ کہنے کی وجہ اس لیے پیش آئی کہ مخالفین یہ کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ جو حقائق و معارف بیان کررہے ہیں، وہ کسی اہل کتاب سے سیکھ کر بیان کرتے ہیں۔

اس طرح اس آیت سے آپ ﷺ کی مطلق قرأت وکتابت کی نفی نہیں ثابت ہوتی بلکہ یہ کہا جارہا ہے کہ آپ ﷺ نبوت سے قبل کتاب الٰہی سے ناواقف تھے، بعینہ یہی بات دوسری آیت میں بھی کہی گئی ہے:

مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ (شوریٰ ۴۲:۵۲)	آپ نہ کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو۔

یہاں کتاب اور ایمان کو معرف باللام لایا گیا ہے اور کتاب کا ذکر ایمان کے ساتھ کیا گیا ہے، جس سے بداہتاً واضح ہوجاتا ہے کہ آپ ﷺ نبوت سے قبل ایمان اور کتب سماوی سے ناواقف تھے۔

بعض روایتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ فن کتابت کے رموز ونکات سے بھی آشنا تھے، اس بنا پر حضرت امیر معاویہؓ جیسے مشہور کاتب کو کبھی کبھی آپ ﷺ ہدایت کرتے تھے کہ "ب" کو سیدھا کرو، "س" کے دندانے بناؤ، "م" کو ٹیڑھا مت کرو اور "بسم اللہ" کو زیادہ مت کھینچو۔(۱)

رہی وہ روایت جو امام بخاری نے بدء الوحی میں نقل کی ہے کہ غار حرا میں جب آپ ﷺ کے پاس فرشتہ آیا تو اس نے کہا "اقرأ" (پڑھو)، آپ ﷺ نے جواب دیا کہ "ما انا بقارئ" (میں قاری نہیں)، فرشتہ نے دوبارہ پھر یہی کہا تو اس بار بھی آپ ﷺ نے وہی جواب دیا مگر جب

(۱) فتح الباری، ج ۷، ص ۴۰۶ بحوالہ قاضی عیاض

تیسری بار فرشتہ نے اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ الخ (پڑھو اپنے اس رب کے نام سے جس نے پیدا کیا) کہا تو حضور ﷺ نے جس طرح اسے سنا تھا دہرا دیا، حسب عادت حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری جلد اول میں اس کی متعدد توجیہات نقل کی ہیں، ایک توجیہ کا حاصل یہ ہے کہ عربی میں قرأت کے دو معنی ہیں، ایک معنی یہ ہے کہ کسی کتاب، کسی مضمون یا کسی تحریر کو پڑھنا اور دوسرے زبانی یاد سے کچھ سنانا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتہ آپ ﷺ سے کسی نوشتہ کو پڑھنے کے لیے نہیں کہہ رہا تھا بلکہ زبانی پڑھنے اور سنانے کی درخواست کر رہا تھا۔

"ما انا بقارئ" میں ما کو عام طور سے نافیہ مانا جاتا ہے لیکن بعض اہل علم کے نزدیک یہ استفہامیہ ہے، کیوں کہ اس موقع پر بعض روایتوں میں ما انا بقارئ کے بجائے "کیف اقرأ" اور "ماذا اقرأ" کے الفاظ منقول ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ما استفہامیہ ہے، چنانچہ جب تک فرشتہ صرف اقرأ کہتا رہا، آپ ﷺ "ما انا بقارئ" فرماتے رہے مگر جب اس نے آیت پڑھی تو آپ ﷺ نے اس کو اپنی زبانِ مبارک سے ادا فرما دیا۔

قرآن مجید جب نازل ہوتا تو آپ ﷺ اس کو زبانی پڑھتے اور یاد کرنے کی کوشش کرتے اور اس میں عجلت کرتے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو روکا جاتا کہ قرآن کو ضائع ہونے سے بچانے والا اللہ تعالیٰ ہے، ارشاد الٰہی ہے:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (قیامہ ۷۵: ۱۶ تا ۱۹)

قرآن سیکھنے کے لیے اپنی زبان کو جلدی نہ چلاؤ، اسے جمع کرنا اور سنانا ہمارے ذمہ ہے پس جب ہم اس کو سنا چکیں تو اس سنانے کی پیروی کرو، پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی وضاحت کرنا۔

دوسری جگہ فرمایا:

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰىٓ (اعلیٰ ۸۷: ۶) ہم تمہیں پڑھائیں گے تو تم نہ بھولو گے۔

عرصہ ہوا اس موضوع پر مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا ایک عالمانہ مضمون "فکر و نظر" علی گڑھ میں چھپا تھا جو بعد میں "چار علمی مقالات" کے عنوان سے کتابی صورت میں بھی چھپا تھا، اس میں

اس پر مفصل بحث کی گئی ہے، ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے امی اور آپ ﷺ کی قوم کے امیین ہونے سے ان کو ناخواندہ اور سراسر غیر تعلیم یافتہ سمجھنا صحیح نہیں ہے، اب ہم عہد جاہلیت اور اسلام کے ابتدائی دور کی علمی و تعلیمی حالت، نوشت و خواند کی کیفیت تحریر کرتے ہیں اور آگے یہ بھی واضح کریں گے کہ اس زمانے میں کتابوں کی نشر و اشاعت کا نہ سہی مخطوطہ نویسی کا آغاز ہو چکا تھا، پروانے، دستاویزیں اور کتبے بھی وجود میں آگئے تھے اور مسلمانوں نے ان کے تحفظ و بقا اور کتب خانوں اور کتابوں کی حفاظت کا بڑی حد تک سامان بھی کیا اور تحقیق و تعلیق کے بعد انہیں شائع کرنے میں بھی بڑی سعی و جاں فشانی کی۔

مورخین کا بیان ہے کہ طویل عرصے تک عربی زبان صرف بولی جاتی تھی، اسے لکھنے کا رواج نہ تھا، اس کی وجہ یہ بھی ہوگی کہ عربوں کو جس طرح اپنی طلاقت لسانی پر ناز تھا، اسی طرح انہیں اپنے حافظے پر بھی بڑا فخر اور بہت بھروسا تھا اور وہ کسی چیز کو قلم بند کرنے اور ضبط تحریر میں لانے کو کسر شان سمجھتے تھے، مولانا شبلیؒ رقم طراز ہیں:

"عربوں میں انساب کا چرچا اس قدر عام تھا کہ ان کا بچہ بچہ اپنے آبا و اجداد کے نام اور رشتے ناتے دس دس بارہ بارہ پشتوں تک محفوظ رکھتا تھا، یہاں تک کہ انسانوں سے گزر کر گھوڑوں اور اونٹوں کے نسب نامے محفوظ رکھے جاتے تھے یا ایام العرب جس کی بہ دولت عکاظ کے سالانہ میلے میں قومی کارناموں کی روایتیں سلسلہ بہ سلسلہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں تک پہنچ جاتی تھیں یا شاعری جس کا یہ حال تھا کہ اونٹ چرانے والے بدو جن کو لکھنے پڑھنے سے کچھ سروکار نہ تھا، اپنی زبان آوری کے سامنے تمام عالم کو ہیچ سمجھتے تھے اور درحقیقت جس سادگی اور اصلیت کے ساتھ وہ واقعات اور جذبات کی تصویر کھینچ سکتے تھے، دنیا میں کسی قوم کو یہ بات کبھی نصیب نہیں ہوئی۔"

اس بنا پر عرب میں جب تمدن کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے تاریخی تصنیفات وجود میں آئیں، اسلام سے بہت پہلے بادشاہان حیرہ نے تاریخی واقعات قلم بند کرائے اور وہ مدت تک محفوظ رہے، چنانچہ ابن ہشام نے کتاب التیجان میں

تصریح کی ہے کہ میں نے ان تالیفات سے فائدہ اٹھایا''۔(۱)

حیرہ سے کوئی شخص جس کا رشتہ ابوسفیان کے والد حرب سے تھا، مکہ آیا اور اس نے انہیں لکھنا سکھایا، زمانہ جاہلیت میں اہم چیزیں اور دستاویزیں لکھ لینے کی ابتدا ہوگئی تھی، سبعہ معلقہ جو سات چیدہ عربی شعرا کے قصائد پر مشتمل ہے، اس کو لکھ کر احتراماً خانہ کعبہ میں آویزاں کر دیا گیا تھا، مامون کے خزانے میں ایک خط تھا جو رسول اللہ ﷺ کے دادا عبدالمطلب کا تھا، علامہ بلاذری نے فتوح البلدان میں تصریح کی ہے کہ عہد نبوی کے آغاز میں سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس فہرست میں ایک خاتون کا نام بھی شامل ہے جن کا نام شفا بنت عبداللہ تھا اور جو ان سترہ آدمیوں کے علاوہ تھیں، وہ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچیں تو چوں کہ وہ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں، رسول اکرم ﷺ نے انہیں مدینہ کے ایک بازار میں کسی عہدے پر مامور کیا تھا۔(۲)

شفا بنت عبداللہ ام المومنین حضرت حفصہ کی رشتہ دار تھیں اور انہوں نے ان سے لکھنا سیکھا تھا (۳)، حضرت حفصہ کے علاوہ ام المومنین حضرت عائشہ بھی لکھنا پڑھنا جانتی تھیں (۴) مگر بلاذری کا بیان ہے کہ وہ مصحف پڑھ لیتی تھیں مگر لکھنا نہیں جانتی تھیں۔(۵)

رسول اللہ ﷺ کے مکے میں قیام کے زمانے میں اس مشہور صحیفے کا تذکرہ سیرت کی کتابوں میں ملتا ہے جس کے مطابق مکے والوں نے سرور کائنات ﷺ اور آپ کے خاندان والوں کا بائیکاٹ کیا تھا اور یہ لوگ شعب ابی طالب میں محصور کر دیے گئے تھے، اس معاہدے کو لکھ کر خانہ کعبہ میں لٹکا دیا گیا تھا مگر دیمک چاٹ جانے کی وجہ سے یہ معاہدہ منسوخ ہوگیا تھا (۶)، ایک صحابی حضرت تمیم داری ہجرت سے قبل مکہ آکر مسلمان ہو گئے تھے، انہوں نے درخواست کی کہ میں ملک شام

(۱) مولانا شبلی: الفاروق حصہ اول (تمہید) ص ۳، معارف پریس اعظم گڈھ، ۱۳۷۶ھ/ ۱۹۵۶ء، (۲) بلاذری: فتوح البلدان، ص ۴۷۶ (۳) سنن ابی داؤد، کتاب الطب باب فی الرقی، ص ۵۴۲، اصح المطابع (۴) امام مالک: موطا کتاب الصلوۃ، الصلوۃ الوسطی، ص ۴۸، مطبع احمدی دہلی، ۱۲۶۶ھ (۵) بلاذری: فتوح البلدان، ص ۴۷۸، مطبوعہ قاہرہ، ۱۳۱۶ھ (۶) ابو محمد عبدالملک بن ہشام کتاب السیرۃ، جلد اول، ص ۲۱۵، مطبع محمد علی مصر و محمد بن سعد: کتاب الطبقات جز اول قسم اول ص ۱۳۹، ۱۴۰، مطبع بریل لیڈن، ۱۳۲۲ھ۔

سے آرہا ہوں، جب شام فتح ہو تو اس کے فلاں فلاں گاؤں مجھے بطور جاگیر مرحمت فرما دیے جائیں اور اس کے لیے مجھے پروانہ عطا فرما دیجیے، چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں پروانہ دے دیا (۱)۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب شام فتح ہوا اور وہ یہ خط لے کر ان کے پاس پہنچے تو حضرت عمر نے کہا میں اس کا شاہد ہوں اور انہوں نے جاگیر انہیں عطا کر دی (۲)۔

رسول اللہ ﷺ کی ہجرت سے پہلے جب انصار نے اسلام قبول کیا اور عقبہ میں آپ ﷺ سے بیعت کی تو ان کی درخواست پر آپ ﷺ نے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو ان کی تعلیم و تربیت کے لیے مدینہ منورہ بھیجا اور انہیں ایک تحریری نسخہ بھی عطا کیا جو اس وقت تک کی نازل شدہ قرآنی آیتوں پر مشتمل تھا۔(۳)

حضرت مصعبؓ کی دعوت و تبلیغ سے مدینہ میں اسلام کے حلقہ بگوشوں کی تعداد برابر بڑھنے لگی اور اگلے سال حج کے زمانے میں بہتر آدمی آئے اور آپ ﷺ سے بیعت ہوئے، اس موقع پر یہ تحریری معاہدہ ہوا کہ ''ہم آنحضرت ﷺ کی ایسی ہی حفاظت کریں گے جیسی اپنے اہل و عیال کی کرتے ہیں، آنحضرت ﷺ کی طرف سے بھی انہیں اطمینان دلایا گیا کہ جو تمہارا دشمن ہے وہ میرا بھی دشمن ہے، جو تمہارا حلیف ہے وہ میرا بھی حلیف ہے، تمہاری ذمہ داری میری ذمہ داری ہے اور میری ذمہ داری تمہاری ذمہ داری اور تمہاری عزت میری عزت ہے اور میری عزت تمہاری عزت ہے''۔(۴)

رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکرؓ کے ہم راہ جب مدینہ ہجرت کے لیے تشریف لے جا رہے تھے تو سراقہ بن مالک نے آپ ﷺ کو پالیا مگر وہ آپ ﷺ کو گرفتار کرنے میں ناکام رہے اور آپ ﷺ سے عفو کے خواہاں ہوئے اور درخواست کی کہ مجھے ایک پروانہ امن عطا ہو، آپ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو پروانہ لکھنے کا حکم دیا جو انہوں نے کسی ہڈی یا کاغذ کے ٹکڑے پر لکھ کر دیا (۵)، اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر میں آپ ﷺ کاغذ، قلم اور دوات بھی ساتھ رکھتے

(۱) قلقشندی: صبح الاعشی، ج ۱۳، ص ۱۱۴، مطبع امیریہ قاہرہ ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۸ء و ابن اثیر جزری: اسد الغابہ ج ۱، ص ۲۱۵، جمعیۃ المعارف (۲) ابوعبید: کتاب الاموال، ص ۲۷۴، مطبوعہ قاہرہ بہ تصحیح محمد حامد فقی ۱۳۵۳ھ (۳) الطبقات جزء اول قسم اول، ص ۱۴۸ (۴) سیرت ابن ہشام: ج ۱، ص ۲۶۶ (۵) ایضاً ص ۲۹۴۔

تھے، حضرت بلال بن حارثؓ کو رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ کی معدنوں کا ٹھیکہ دیا تھا آپ ﷺ کا یہ فرمان تحریری صورت میں تھا(۱) جسے ان کی اولاد نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے سامنے پیش کیا تھا، اس طرح کے اور ٹھیکوں اور اقطاع دینے کا ذکر ابوعبید نے کتاب الاموال میں کیا ہے۔

مدینہ پہنچ کر آپ ﷺ نے یہود مدینہ سے جو معاہدہ کیا تھا، اس کا ذکر سیرت کی کتابوں میں موجود ہے، چوں کہ انصار کے دونوں ہم پایہ قبائل اوس وخزرج اکثر باہم صف آرا رہتے تھے اور یہود کی بھی یہی کوشش رہتی تھی کہ وہ باہم متحد نہ ہوں، اس لیے آپ ﷺ نے مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات کو منضبط اور واضح کرنے کے لیے انصار اور یہود کو بلوا کر معاہدہ لکھوایا، جس کی دستاویز آپ ﷺ نے مدینے جا کر مرتب کی تھی اور اسے کتاب اور صحیفہ کا نام دیا تھا، اس کی حیثیت متعلقہ لوگوں کے لیے دستور العمل کی تھی، یہ دستاویز مدینہ کے حالات، فوری ضروریات اور اس وقت کے مسائل کو پیش نظر رکھ کر تیار کی گئی تھی اور اس کی ابتدائی ۲۳ دفعات مہاجرین اور انصار کے متعلق قواعد پر تھی اور بقیہ کا تعلق مدینہ کے یہودی قبائل سے تھا، ان دونوں میں یہ بات دہرائی گئی تھی کہ آخری عدالت (مرافعہ) رسول اللہ ﷺ کی ذات ہوگی (۲)، اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ مدینہ کی نئی مملکت میں اپنے اور مقامی باشندوں کے حقوق کا تعین کر دیا جائے، مہاجرین کی بود و باش کا مسئلہ حل ہو جائے، شہر کے غیر مسلم باشندوں خصوصاً یہود مدینہ سے سمجھوتا ہو جائے اور شہر کی سیاسی تنظیم اور فوجی مدافعت کا انتظام ہو جائے۔

مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے آنے کے باوجود کفار قریش آپ ﷺ کو چین اور سکون سے رہنے نہیں دے رہے تھے، اس لیے مدینہ کے اطراف کے متعدد قبائل سے بھی آپ ﷺ نے معاہدے کیے، جہینہ کے قبیلے سے دوستی کا معاہدہ ۱ھ میں کیا تھا، بنوضمرہ سے ۲ھ میں معاہدہ ہوا، اس کا متن سہیلی کی الروض الانف میں ملتا ہے، ان کے علاوہ بھی متعدد قبائل اور اشخاص سے معاہدوں کا ذکر کتب سیر میں ملتا ہے، جنہیں الوثائق السیاسیۃ میں جمع کر دیا گیا ہے (۳)، تبوک میں دومۃ الجندل کے حکمراں اکیدر نے جب اطاعت کا معاہدہ کیا تو آنحضرت ﷺ نے دستاویز پر اپنے ناخن

(۱) ابوداؤد کتاب الخراج والفئی باب اقطاع الارضین، ج ۲ ص ۴۳۵ (۲) ڈاکٹر محمد حمید اللہ: الوثائق السیاسیۃ، القسم الاول ص ۱-۷، مطبع لجنۃ التالیف والنشر، قاہرہ ۱۹۴۱ء (۳) دیکھیے صفحات ۱۴۸ تا ۲۰۰۔

سے مہر لگائی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ اکیدر کے وطن حیرہ کا یہ پرانا دستور تھا کہ معاہدوں پر انگوٹھے کے بجائے ناخن کا نشان لیتے تھے (۱)، سب سے اہم صلح حدیبیہ کا معاہدہ ہے، جس کا ذکر آگے آرہا ہے، یہ سب معاہدے تحریری اور خطی تھے۔

مدینہ تشریف لے جانے کے بعد آپ ﷺ نے مسجد نبوی تعمیر کرائی، صفہ اس کا حصہ تھا جس میں ایک سائبان اور چبوترہ تھا، اس کی حیثیت اقامتی درس گاہ کی تھی جس میں لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا تھا، رات میں طلبہ وہیں قیام کرتے تھے، عبداللہ بن سعید بن العاصؓ نے زمانہ جاہلیت ہی میں لکھنا سیکھ لیا تھا اور اسی وقت سے خوش خط کاتب کی حیثیت سے مشہور تھے (۲)، یہ وہاں لکھنا سکھاتے تھے، عبادہ بن صامتؓ کو بھی رسول اللہ ﷺ نے صفہ میں لوگوں کو لکھنا سکھانے اور قرآن پڑھانے کے لیے مامور کیا تھا (۳)، مدینہ میں ایک اور اقامتی درس گاہ دارالقراء کا پتا چلتا ہے (۴)، بلاذری کا بیان ہے کہ اس زمانے میں مدینہ میں نو مسجدیں تھیں اور ان سب میں درس و تدریس کا کام ہوتا تھا اور لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا تھا، اسی لیے رسول اکرم ﷺ بچوں کو تلقین کرتے تھے کہ اپنے پڑوس کی مسجد میں سبق پڑھا کریں۔(۵)

بدر میں جو لوگ قید ہوئے تھے، ان میں تعلیم یافتہ لوگوں سے مالی فدیہ لینے کے بجائے یہ حکم دیا گیا کہ ہر ہر آدمی دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے۔(۶)

آپ ﷺ نے صرف مذہبی تعلیم اور عربی زبان کی تحصیل کو کافی نہیں سمجھا کیوں کہ مدینہ میں یہودیوں سے مختلف معاملات پیش آتے رہتے تھے، کبھی کبھی ان سے خط کتابت بھی کرنی پڑتی تھی، اس لیے آپ ﷺ نے اپنے خاص کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ کو عبرانی زبان اور اس کا رسم الخط سیکھنے کی تاکید کی (۷)، حضرت زید بن ثابتؓ کو عربی، عبرانی، قبطی اور فارسی زبانیں آتی تھیں اور انہوں نے یہ سب زبانیں خود مدینہ میں اہل زبان سے سیکھی تھی (۸)۔

(۱) صحیفہ ہمام بن منبہ ص ۱۹ و ۲۰ بحوالہ طبقات ابن سعد و اصابہ ابن حجر تذکرہ وجب بن اکیدر (۲) ابن اثیر: اسد الغابہ ج ۳، ص ۱۷۵ (۳) اسد الغابہ، ج ۳ ص ۱۰۶ (۴) صحیفہ ہمام بن منبہ ص ۱۱ (۵) ایضاً ص ۱۲ (۶) طبقات ابن سعد، جزء ثانی قسم اول ص ۱۴، مطبوعہ لیڈن ۱۳۲۵ھ و ابوالقاسم عبدالرحمن السہیلی: الروض الانف ج ۲ ص ۹۲ مطبع جمالیہ مصر ۱۳۳۲ھ، ۱۹۱۴ء (۷) تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۴۶۰ واقعات ۴ھ (۸) طبقات ابن سعد جزء ثانی قسم ثانی ص ۱۱۵۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ بھی عبرانی اور سریانی سے واقف تھے (۱)، حضرت عمرؓ نے اسلام سے پہلے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا (۲)، قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ جانے کے بعد انہوں نے بھی عبرانی زبان کی تحصیل کرلی تھی (۳)، اس وقت تک توریت کا ترجمہ عربی میں نہیں ہوا تھا، اس لیے جب توریت سے کچھ کام پڑتا تو عبرانی نسخے ہی کی طرف رجوع کیا جاتا تھا اور چوں کہ مسلمان عبری نہیں جانتے تھے اس لیے یہودی پڑھ کر سناتے تھے جو بعض اوقات اس میں گھپلا کردیتے تھے، اسی لیے آپ ﷺ نے خاص طور پر صحابہ کو یہودیوں کی مذہبی زبان سیکھنے کی ہدایت کی تھی، کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ یہودیوں کے ہفتہ واری درسِ توریت میں شریک ہوتے تھے۔

انسان خطاء ونسیان سے مرکب ہے، اس کی یادداشت خواہ کتنی ہی اچھی ہو مگر بھول چوک لابد ہے، اس لیے قرآن مجید نے بھی معاہدات، بیع وشرا، اقرار وشہادت اور قرض کی لین دین وغیرہ کو لکھ لینے کا حکم دیا اور کہا کہ لکھنے میں گھبراہٹ نہ محسوس کرو:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْہُ (بقرہ ۲:۲۸۲)	اے ایمان والو! جب تم آپس میں کسی مقررہ مدت کے لیے قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لو۔

آگے اسی آیت میں اس کی بھی ہدایت کی گئی کہ اس طرح کے معاہدوں اور معاملات کے لیے دو گواہ بھی حاصل کرلیے جائیں۔

۶ھ میں صلح حدیبیہ ہوئی، اس میں جن شرطوں پر اتفاق ہوا، آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو بلا کر حکم دیا کہ معاہدے کے الفاظ قلم بند کریں، حضرت علیؓ نے آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم سے کیا، عرب کا قدیم دستور یہ تھا کہ خطوط کی ابتدا میں باسمک اللّٰھم لکھتے تھے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ زمانہ اسلام سے قبل خطوط لکھے جاتے تھے مگر چونکہ وہ بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ناآشنا تھے، اس لیے قریش کے نمائندے سہیل بن عمروؓ نے کہا، اس کے بجائے وہی قدیم الفاظ لکھے جائیں، آنحضرت ﷺ نے منظور فرمالیا، آگے کے فقرے "ھذا ما قاضی علیہ محمد رسول اللہ"

---

(۱) ابن اثیر: اسد الغابہ ج ۳، ص ۲۳۳ (۲) بلاذری: فتوح البلدان، ص ۴۷۷، مطبوعہ مصر (۳) سنن دارمی، ص ۶۲، مطبع نظامی کان پور، ۱۲۹۳ھ۔

پر پھر سہیل نے اعتراض کیا کہ اگر ہم آپ ﷺ کو رسول اللہ تسلیم کرتے تو پھر جھگڑا کیا تھا، آپ ﷺ صرف اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھوائیں، رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ سے کہا، اچھا خالی میرا نام لکھو، حضرت علیؓ نے اس سے معذرت کی تو آپ ﷺ نے خود ہی اپنا نام لکھ دیا (۱)

آپ ﷺ چونکہ ساری دنیا کے لیے پیغمبر اور رحمۃ للعالمین تھے، اس لیے جب آپ ﷺ کو صلح حدیبیہ کی وجہ سے کسی قدر اطمینان نصیب ہوا تو آپ ﷺ نے سلاطین روم، مصر و فارس اور رؤسائے عرب کے نام دعوت اسلام کے خطوط بھجوائے، یہ سارے خطوط اب مطبوع ہوچکے ہیں اور سیر کی کتابوں کے علاوہ علاحدہ بھی ان کے مجموعے مرتب کیے گئے ہیں۔

رفتہ رفتہ پورے عرب میں اسلام پھیلتا جارہا تھا، اس لیے مختلف مقامات کے مسلمانوں کو اسلامی احکام وتعلیمات سے واقف کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ دعات اور مبلغین روانہ فرماتے تھے اور وہاں امن وامان قائم کرنے اور عدل وانصاف کے قوانین نافذ کرنے، باہمی نزاع کو ختم کرانے اور مقدمات کے فیصلے کرنے کے لیے ولات وحکام بھیجتے تھے، عمرو بن حزمؓ کو نجران کا گورنر بنا کر بھیجا گیا تو انہیں فرائض منصبی کے متعلق ایک تحریری ہدایت نامہ دیا گیا، اس میں جہاں انتظامی امور کے متعلق ہدایات دی گئی تھیں وہاں تعلیم کی اشاعت کے بھی احکام مذکور تھے (۲)، عمرو بن حزمؓ نے اس قیمتی دستاویز کو نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ اس میں ۲۱ دیگر فرامین نبوی کو بھی جمع کردیا تھا (۳)، آپ ﷺ ہر جگہ قضات، معلمین اور محصلین زکوۃ بھی مقرر فرماتے تھے جن کے نام سیر کی کتابوں میں مذکور ہیں، ان سب کو وقتاً فوقتاً تحریری ہدایات اور فرامین جاری کیے جاتے تھے، آپ ﷺ نے اپنی آخری زندگی میں زراعت، جانوروں کے ریوڑوں، معدنیات وغیرہ میں حکومت کو ادا کی جانے والی زکوۃ کے محصول کی شرحیں تحریر کرائیں لیکن اسے مقبوضہ علاقوں میں بھیجنے سے پہلے آپ ﷺ کا انتقال ہوگیا مگر آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے خلفا نے اس پر عمل کیا۔ (۴)

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الصلح، باب کیف یکتب ھذا ما صالح فلان بن فلان، ج ۱ ص ۳۷۲، اصح المطابع دہلی و کتاب المغازی باب عمرۃ القضا، ج ۲ ص ۶۱۰ و صحیح مسلم کتاب الجہاد باب صلح الحدیبیۃ فی الحدیبیۃ، ج ۲ ص ۸۷، مطبوعہ مصر (۲) اسد الغابہ، ج ۴ ص ۹۹ (۳) ڈاکٹر محمد حمید اللہ: صحیفہ ہمام بن منبہ (دیباچہ) ص ۲۹ (۴) ابوداؤد کتاب الزکوۃ باب فی زکوۃ السائمہ، ج ۱ ص ۲۱۹ و ترمذی کتاب الزکوۃ باب ما جاء فی زکوۃ الابل والغنم ص ۱۳۶۔

اسی غرض سے عہدۂ انشا قائم کیا گیا تھا جس پر کُتاب کی حیثیت سے بڑے بڑے صحابہ مامور رہے، شرحبیل بن حسنہ کندیؓ سب سے پہلے اس شرف پر ممتاز ہوئے، یہ نہایت قدیم الاسلام تھے، مکہ میں ان ہی نے سب سے پہلے کتابت وحی کی خدمت انجام دی، قریش میں سب سے پہلے کاتب عبداللہ بن ابی سرحؓ تھے، مدینہ میں اس کی اولیت کا شرف حضرت ابی بن کعبؓ کو حاصل ہوا۔

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عامر بن فہیرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ، حضرت عبداللہ بن ارقمؓ، حضرت ثابت بن قیس بن شماسؓ، حضرت حنظلہ بن الربیع الاسدیؓ، حضرت مغیرہؓ بن شعبہؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ، حضرت خالد ابن ولیدؓ، حضرت خالد بن سعید بن العاصؓ، حضرت علاء بن حضرمیؓ، حضرت حذیفہ بن الیمانؓ، حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ، حضرت زید بن ثابتؓ مختلف اوقات میں اس منصب پر مامور رہے، حضرت علیؓ نے صلح نامہ حدیبیہ لکھا، امراو سلاطین کے نام خطوط حضرت عامر بن فہیرہؓ لکھتے تھے اور امرائے عمان کے نام آپ ﷺ نے جو مکتوب بھیجا تھا وہ حضرت ابی بن کعبؓ کا لکھا تھا، قطن بن حارثہ کو جو خط بارگاہ نبوت سے روانہ کیا گیا تھا وہ حضرت ثابت بن قیسؓ نے لکھا تھا لیکن عام طور پر کتابت کی خدمت حضرت زید بن ثابتؓ کے متعلق تھی اور صحابہ کے گروہ میں ان کا نام اس حیثیت سے زیادہ نمایاں تھا اور جیسا کہ گزرا انہیں یہ خاص امتیاز بھی حاصل تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے عبرانی زبان سیکھی تھی۔

توقیعات اور فرامین کی ابتدائی شکل بھی زمانہ نبوت میں وجود میں آگئی تھی اور اس خدمت پر پہلے حضرت زید بن ثابتؓ اور آخر میں حضرت امیر معاویہؓ مامور ہوئے، ان کے علاوہ دوسرے صحابہ کرام بھی وقتاً فوقتاً یہ خدمت انجام دیتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے سلاطین وملوک کو دعوت اسلام کے جو خطوط روانہ فرمائے، غیر قوموں کے ساتھ جو معاہدے کیے، مسلمان ہونے والے قبائل کو جو احکام بھیجے، عمال و محصلین کو جو تحریری فرامین عنایت کیے، فوج کا جو رجسٹر مرتب کرایا، بعض صحابہ کو جو حدیثیں لکھوائیں وہ سب اسی سلسلے میں داخل ہیں، زرقانی نے شرح موطا میں آپ ﷺ کے فرامین واحکام تحریری کا ایک مستقل باب باندھا ہے۔(۱)

(۱) سیرۃ النبی ج ۲ ص ۷۷، جدید اڈیشن۔

ایک دفعہ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ جو لوگ اس وقت تک اسلام لاچکے ہیں، ان کے نام قلم بند کیے جائیں، چنانچہ پندرہ سو صحابہ کے نام دفتر میں درج کیے گئے۔(۱)

نبی ﷺ کے دور میں حروف پر نقطے لگانے کی ابتدا بھی ہوگئی تھی جیسا کہ پہلے گزرا حضرت امیر معاویہؓ جیسے مشہور کاتب کو آپ ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ ''ب'' کو سیدھا کرو ''س'' کے دندانے بناؤ ''م'' کو ٹیڑھا مت کرو اور ''بسم اللہ'' کو زیادہ مت کھینچو۔(۲)

مصر میں حضرت عمرؓ کے زمانے کے دو خطوط دریافت ہوئے ہیں جن پر نقطے لگے ہیں، یہ ۲۲ھ کے لکھے ہیں اور حضرت امیر معاویہؓ کے حکم سے طائف کے گورنر نے ایک تالاب تعمیر کرایا تھا، اس پر ایک کتبہ کندہ تھا جس کے کئی حروف پر نقطے تھے اور کئی پر نقطے نہیں تھے، یہ ۵۰ھ کا واقعہ ہے۔(۳)

عہد نبوی کا سب سے مہتم بالشان کارنامہ قرآن کی جمع وکتابت اور تحریر وتدوین ہے، قرآن مجید نجماً نجماً نازل ہوتا تھا جس کو آپ کے حکم سے کاتب صحابہ کرام بعض ٹکڑوں یا کاغذ پر لکھ لیتے تھے، اپنی وفات کے وقت آپ ﷺ نے پورے قرآن کو مرتب ومدون چھوڑا تھا، صحیح حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنا قرآن نازل ہو چکا ہوتا تھا، رسول اللہ ﷺ کو رمضان میں اس کا ورد حضرت جبرئیل کراتے تھے (۴)، یہ اہتمام اس کی صحت وحفاظت کے خیال سے کیا جاتا تھا کہ اس میں کوئی کمی بیشی اور تغیر وتبدل نہ ہو، قرآن مجید کی موجودہ ترتیب توقیفی ہے جو اللہ کے حکم ومنشا کے مطابق آپ ﷺ نے کرائی تھی، جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ ﷺ کاتبین وحی صحابہ کو حکم دیتے کہ اس کو فلاں سورہ میں فلاں آیت کے پہلے یا بعد میں لکھ دو!

قرآن مجید کے بعد مسلمانوں کے نزدیک سب سے مقدس اور اہم چیز رسول اللہ ﷺ کے ارشادات وفرمودات ہیں جن کی صحت میں جس قدر اہتمام کیا گیا، وہ عدیم النظیر ہے، اس کا اعتراف آج کل کے محققین کو بھی ہے اور وہ متون کی صحت وضبط کے لیے اس کو نمونہ بناتے ہیں، مولانا شبلی رقم طراز ہیں:

(۱) بخاری کتاب الجہاد والسیر باب کتابۃ الامام للناس (۲) خطبات بہاول پور ص ۲۲۷ (۳) ابن حجر فتح الباری ج ۷ ص ۴۰۶ (۴) صحیح بخاری کتاب ابواب فضائل القرآن باب کان جبرئیل یعرض القرآن علی النبی ﷺ ج ۲ ص ۷۴۸۔

"مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کوئی حریف نہیں ہوسکتا کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کے حالات اور واقعات کا ایک ایک حرف اس استقصا کے ساتھ محفوظ رکھا کہ کسی شخص کے حالات آج تک اس جامعیت اور احتیاط کے ساتھ قلم بند نہیں ہوسکے اور نہ آیندہ توقع کی جاسکتی ہے، اس سے زیادہ کیا عجیب بات ہوسکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے افعال اور اقوال کی تحقیق کی غرض سے آپ ﷺ کے دیکھنے اور ملنے والوں میں سے تقریباً تیرہ ہزار شخصوں کے نام اور حالات اس وقت قلم بند کیے گئے جب تصنیف وتالیف کا آغاز تھا"۔ (۱)

احادیث کی صحت کو جانچنے اور پرکھنے کے دو اصول اور معیار قرار دیے گئے یعنی روایت ودرایت جس کے قواعد وقوانین کے لیے اسماء الرجال اور جرح وتعدیل پر کتابیں لکھی گئیں۔

یہ بات صحیح ہے کہ شروع میں رسول اللہ ﷺ نے احادیث کی تحریر وکتابت سے منع کیا تھا لیکن یہ ممانعت مطلق اور دائمی نہیں تھی بلکہ خاص مصالح کی بنا پر کی گئی تھی جو وقتی تھی، ابتدا میں کم لوگوں کو اچھی طرح لکھنا آتا تھا، اس کی وجہ سے خطرہ تھا کہ وہ غلط شلط نہ لکھ دیں، دوسرے ابتدا میں خاص صحابہ کے علاوہ عام مسلمانوں میں اللہ کے کلام اور رسول کے کلام کے درمیان فرق وامتیاز کا صحیح مذاق نہیں پیدا ہوا تھا، اس بنا پر دونوں کے مخلوط اور گڈمڈ ہوجانے کا اندیشہ تھا، اس لیے ابتدا میں آپ ﷺ نے ممانعت کی تھی لیکن جب فن کتابت ترقی کرگیا اور صحابہ میں اللہ ورسول ﷺ کے کلام میں فرق وامتیاز کی پوری صلاحیت ہوگئی تو جو لوگ لکھنے میں مہارت رکھتے تھے، انہیں حدیثوں کی کتابت کی اجازت دے دی گئی، حضرت رافع بن خدیجؓ سے روایت ہے کہ "مدینہ حرم ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسے حرم قرار دیا ہے اور یہ ہمارے پاس ایک خولانی چمڑے پر لکھا ہے"۔ (۲)

حضرت ابوہریرہؓ کا قول ہے کہ "صحابہ میں مجھ سے زیادہ کسی کو حدیثیں محفوظ نہیں، سوائے عبداللہ بن عمروؓ کے، کیوں کہ وہ حدیثیں لکھ لیتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا"۔ (۳)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی عادت تھی کہ آنحضرت ﷺ سے جو سنتے تھے لکھ لیتے تھے، قریش

(۱) سیرۃ النبی ج ۱ص ۸، طبع جدید، ۲۰۰۳ء (۲) مسند احمد بن حنبل، ج ۴، ص ۱۴۱ (۳) صحیح بخاری کتاب العلم باب کتابۃ العلم، ج ۱ص ۲۲۔

نے ان کو منع کیا کہ آپ ﷺ کبھی غیظ وغضب میں ہوتے ہیں، کبھی خوشی اور شادمانی میں اور تم سب کچھ لکھتے جاتے ہو، اس بنا پر لکھنا چھوڑ دیا اور آنحضرت ﷺ سے یہ واقعہ بیان کیا، آپ ﷺ نے دہان مبارک کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ "تم لکھ لیا کرو، اس سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے"۔ (۱) حضرت عبداللہؓ کی اس بیاض کا نام جس میں حدیثیں قلم بند کیا کرتے تھے، صادقہ تھا۔ (۲)، حضرت علیؓ نے بھی حدیثوں کا ایک ذخیرہ تیار کیا تھا جس میں دیت کے متعلق احکام تھے۔ (۳)

خطیب نے روایت کی ہے کہ جب لوگ کثرت سے حضرت انسؓ کے پاس حدیثوں کو سننے کے لیے جمع ہوجاتے تھے تو وہ ایک جنگ نکال لاتے تھے کہ یہ وہ حدیثیں ہیں جو میں نے آنحضرت ﷺ سے سن کر لکھ لی تھیں۔ (۴)

ایک روایت میں ہے کہ ابوقبیل کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمرو سے سنا کہ "ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس حدیثیں لکھتے تھے کہ اتنے میں ایک شخص نے پوچھا، دونوں شہروں میں کون پہلے فتح ہوگا، قسطنطنیہ یا رومیہ" (۵)، ایک انصاری صحابی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنے حافظے کی کمزوری کی شکایت کی کہ آپ ﷺ وعظ وتذکیر میں جو مفید اور کارآمد باتیں ارشاد فرماتے ہیں وہ مجھے بڑی بھلی معلوم ہوتی ہیں لیکن یاد نہیں رہتیں، ارشاد ہوا کہ اپنے داہنے ہاتھ سے مدد لو۔ (۶)

فتح مکہ کے سال جب ایک خزاعی نے حرم میں ایک شخص کو قتل کردیا تو آنحضرت ﷺ نے ناقہ پر سوار ہوکر خطبہ دیا، یمن کے ایک شخص نے آپ ﷺ سے درخواست کی کہ یہ خطبہ مجھ کو تحریر کرادیا جائے، چنانچہ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اس شخص (ابوشاہ) کے لیے وہ خطبہ قلم بند کرادیا جائے۔ (۷) مرض الموت میں آپ ﷺ نے قلم دوات طلب کی تھی اور فرمایا کہ "میں تمہارے لیے ایک تحریر لکھ دوں تا کہ میرے بعد گم راہ نہ ہوجاؤ"۔ (۸) (باقی)

(۱) ابوداؤد کتاب العلم باب روایۃ حدیث اہل الکتاب، کتابۃ العلم، ص ۵۱۳ و ۵۱۴، اصح المطابع (۲) طبقات ابن سعد جزء ثانی قسم ثانی، ص ۱۲۵ (۳) صحیح بخاری کتاب العلم باب کتابۃ العلم ج ۱ص ۲۱ و ابوداؤد کتاب الدیات باب ایقاد المسلم بالکافر ج ۲ص ۶۲۳، اصح المطابع (۴) سیرۃ النبی ج ۱ص ۱۲، طبع جدید (۵) مسند دارمی، ص ۶۸، مطبع نظامی کان پور، ۱۲۹۳ھ (۶) ترمذی ابواب العلم باب ماجاء فی الرخصۃ فیہ ج ۲ص ۹۵ (۷) بخاری کتاب العلم باب کتابۃ العلم، ج ۱ص ۲۱ و ۲۲ و مسلم کتاب الحج باب تحریم مکۃ، ج ۱ص ۵۲۰، مطبوعہ مصر (۸) صحیح مسلم کتاب الفرائض باب ترک الوصیۃ الخ، ج ۲ص ۱۴۔

اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر

بعض اعتراضات کا جائزہ

از:- ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی ☆

"یہ جوابی مضمون ایک برس پہلے لکھا گیا تھا اور اسی وقت مضمون نگار نے اسے میرے حوالے کرنا چاہا تھا مگر میں نے چاہا کہ یہ ماہنامہ جامعہ دہلی ہی میں شائع ہو "قصہ زمین برسر زمین" مگر جب ایک برس تک انتظار کے بعد بھی جامعہ میں نہیں شائع ہوا تو اب "معارف" میں شائع کیا جارہا ہے تاکہ اہل علم کو معلوم ہو کہ ایک بڑے ادارے کے ایک بڑے ذمہ دار نے کچھ "مصالح" کی بنا پر کیسی ناانصافی کی ہے، اورنگ زیب تو مظلوم تھا ہی اب اس کی جائز حمایت کے جرم میں شبلی بھی مظلوم ہوگئے، یاللعجب"۔(معارف)

انگریز مورخوں نے اپنے سیاسی اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے ہندوستان کے مسلمان حکم رانوں پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے، ان میں سب سے زیادہ عالم گیر کو ہدف تنقید و تنقیص بنایا اور اس کی شخصیت کو مطعون و مجروح کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، علامہ شبلی کے الفاظ میں:

"اس کی فرد قرارداد جرم اتنی لمبی ہے کہ شاید کسی مجرم کی نہ ہوگی، باپ کو قید کیا، بھائیوں کو قتل کرایا، دکن کی اسلامی ریاستیں مٹادیں، ہندوؤں کو ستایا، بت خانے ڈھائے، مرہٹوں کو چھیڑ کر تیموری سلطنت کے ارکان متزلزل کردیے"۔(۱)

☆ادب کدہ، معراج پور، انور گنج، اعظم گڈھ۔

علامہ شبلی جن کا مطمح نظر اغلاط تاریخی کی تصحیح اور نئی جہتوں کی رہنمائی سے عبارت تھا، اس اتہام سے کبیدہ خاطر ہوئے، چنانچہ معتبر تاریخوں سے ان الزامات کی تردید کی اور واضح کیا کہ عالم گیر پر عائد الزامات قطعی بے بنیاد اور بے سروپا ہیں۔

علامہ شبلی کی اس بلند پایہ تاریخی کاوش کی عظمت کا اعتراف علی العموم کیا گیا تاہم بعض اہل قلم نے اس پر اعتراضات بھی وارد کیے ہیں جن میں ایک اہم نام مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے جو اصلاً علامہ شبلی ہی کے فیض یافتہ ہیں۔

مولانا آزاد نے فٹ نوٹ کی شکل میں جو اعتراضات کیے تھے اسی کو مدنظر رکھ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ تاریخ و ثقافت کے سابق صدر جناب سید عزیز الدین حسین ہمدانی نے ایک مضمون لکھا ہے، جس میں مولانا آزاد کے اشکالات کو مزید واضح کرنے کی کوشش کی ہے مگر ان کا لب ولہجہ ادعائی اور تاریخی حقائق کے خلاف ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

"مولانا شبلی نعمانی نے اورنگ زیب پر مضامین لکھے تاکہ اورنگ زیب کی پالیسیوں کا صحیح طور پر تجزیہ کیا جاسکے، یہ ایک خوش آیند قدم تھا لیکن شبلی بجائے مورخ کے اورنگ زیب کے وکیل بن گئے اور نتیجتاً اپنے جذبات پر قابو نہ رکھتے ہوئے ان ہی خامیوں کا شکار ہوگئے جس کے شکار خود انگریز اور انگریز نواز ہندوستانی مورخین تھے، شبلی نے شروع ہی میں لکھ دیا کہ ان کا اس کتاب کے لکھنے کا مقصد اورنگ زیب کی طرف داری کرنا ہے جس کے نتیجے میں انہوں نے اپنی حیثیت کو بہ حیثیت مورخ ختم کرلیا، اس لیے کہ مورخ کا کام حقائق کا تجزیہ کرنا ہے نہ کہ طرف داری"۔(۲)

ہمدانی صاحب کا یہ نقطہ نظر اس لیے بے بنیاد ہے کہ اگر کسی کی ذات کو ناروا طور پر مطعون و مجروح کیا جائے تو کیا اس کی تصحیح و تردید کی صورت میں جوابی الزام کے طور پر اسے "وکیل" قرار دیا جائے گا اور جذبات پر قابو نہ رکھنے کا الزام عائد ہوگا، ایک مورخ کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ بے بنیاد الزامات کی تصحیح کرے اور یہ اس کی تاریخی دیانت داری ہوگی، چنانچہ عالم گیر پر عائد الزامات کی تردید علامہ شبلی نے محض تاریخی حقائق کی وضاحت کے طور پر کی ہے، سید شریف الحسن نقوی لکھتے ہیں:

''شبلی نے محض اورنگ زیب کے اسلامی عقائد سے متاثر ہو کر اس کی طرف داری نہیں کی ہے بلکہ تاریخ کا تنقیدی مطالعہ کر کے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اورنگ زیب پر لگائے ہوئے الزامات بے بنیاد ہیں''۔ (۳)

ہمدانی صاحب کا یہ دعوا کہ شبلی نے اس کتاب کا مقصد تالیف اورنگ زیب کی طرف داری قرار دیا ہے، صراحتاً حق و دیانت کے خلاف ہے، علامہ شبلی تو ایک غیر جانب دار مورخ کی حیثیت سے یوں رقم طراز ہیں:

''بے شبہ ہم کو نہایت ٹھنڈے دل سے بے رو رعایت ان جرائم کی تحقیقات کرنی چاہیے اور نہایت احتیاط رکھنا چاہیے کہ میزان عدل کا پلہ طرف داری کے رخ نہ جھک جائے''۔ (۴)

شاہ جہاں اور عالم گیر کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرا دل دکھتا ہے کہ ان میں کسی کو ملزم ٹھہراؤں لیکن سچائی اور تاریخ نویسی کا کیا فرض ہے، شاہ جہاں اور عالم گیر دونوں قابل ادب ہیں لیکن دونوں سے بڑھ کر بھی ایک چیز ہے حق و راستی اور مجھ کو اسی اعلاتر چیز کے سامنے گردن جھکا دینی چاہیے''۔ (۵)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمدانی صاحب نے شبلی کی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا بلکہ ان کے پیش نظر محض حواشی ابو الکلام میں نقل کیے گئے شبلی کے وہ اقتباسات ہیں جو جناب سید مسیح الحسن نے وضاحت کے طور پر نقل کیے ہیں۔

انگریز مورخین اور ان کے ہم نوا ہندوستانی مورخین نے عالم گیر اور عہد عالم گیر کی تاریخ کو جس طرح مسخ کیا ہے اور جس قدر عالم گیر کی تصویر کشی میں کذب و افترا سے کام لیا ہے، اس کو پڑھ کر کوئی بھی حق پسند صاحب نظر غیظ و غضب کا شکار ہو سکتا ہے، علامہ شبلی تو حد درجہ ذکی الحس تھے، چنانچہ وہ اپنے ان احساسات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''یورپین مورخین ایک اعتراض کے بیان کرنے میں جو خود غلط ہوتا ہے، پے در پے اور بہت سے جھوٹ ملاتے چلے جاتے ہیں، جواب دینے والا ایک جھوٹ کا جواب دینا چاہتا ہے تو اسے ایک اور جھوٹ نظر آتا ہے، وہ ادہر متوجہ ہوتا ہے تو ایک اور جھوٹ نمایاں ہوتا ہے، مسلسل دروغ بیانی اور افتراؤں کے ہجوم پر بے اختیار اس کو طیش آجاتا ہے اور بجائے اس کے کہ وہ سکون اور اطمینان کے ساتھ اصل واقعہ کے انکشاف پر متوجہ ہو غصے سے بے قابو ہو جاتا ہے، خود مجھ پر بھی یہی اثر پڑا لیکن میں ان حریفوں کو یہ موقع نہ دوں گا کہ وہ میرے طیش و غضب سے فائدہ اٹھائیں''۔ (۶)

گویا انہوں نے شعوری طور پر جذبات پر قابو رکھتے ہوئے یہ مضامین لکھے جب کہ طیش و غضب کا بہت حد تک امکان تھا، اس کے بعد بھی جذبات پر قابو نہ رکھنے کا الزام کس درجہ بے معنی ہے؟

ہمدانی صاحب کا ایک اعتراض یہ ہے کہ علامہ شبلی نے اپنے مضامین میں تاریخ وار سلسلہ واقعات کا قطعی خیال نہیں رکھا جو اس کتاب کا ایک بڑا نقص ہے (۷)، انہوں نے ثبوت میں ایک فہرست بہ لحاظ سن پیش کی ہے (۸)، مگر خود انہوں نے یہ غور نہیں کیا کہ علامہ شبلی کی اس کتاب کا موضوع عہد عالم گیر کی سلسلہ وار تاریخ نہیں بلکہ ان اعتراضات کا جائزہ ہے جو عالم گیر پر عائد کیے جاتے ہیں، ایسی صورت میں اعتراضات کی نوعیت کے اعتبار سے ترتیب کا قائم کرنا ہی موضوع کے ساتھ انصاف ہے، ہمدانی صاحب محض اعتراض کرنے کے شوق میں اس قدر واضح حقیقت نہیں سمجھ سکے، جہاں تک حقائق کے تجزیے کی بات ہے معمولی سے معمولی شخص بھی مولانا شبلی کی اس کتاب میں ان کے تحقیق و تجزیے کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

متعصب مورخین کا یہ الزام ہے کہ عالم گیر نے شیوا جی کا شایان شان استقبال نہیں کیا ورنہ وہ اس کا مطیع اور فرماں بردار ہو جاتا، علامہ شبلی اس کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شیوا جی کی اطاعت کا سلطنت پر کیا احسان تھا، شاہی فوجوں نے اس کے تمام علاقے فتح کر لیے تھے، وہ قلعہ میں چاروں طرف سے گھر چکا تھا، اس کے خاص صدر نشین قلعے کے برجوں پر شاہی فوج کا پھریرا اڑ چکا تھا، ان مجبوریوں سے وہ ہتھیار رکھ کر غلاموں کی طرح آیا اور دربار میں روانہ کیا گیا تاہم اس کے استقبال کے لیے عالم گیر نے دربار میں سب سے زیادہ جو شخص

موزوں ہوسکتا تھا اس کو بھیجا، پنج ہزاری امرا کی صف میں جو خود راجہ جے سنگھ کا
منصب تھا، اس کو جگہ دی، اس سے زیادہ وہ اور کیا چاہتا تھا؟ کیا شہنشاہ ہند ایک
مفتوح رہزن کے لیے تخت سے اتر آتا؟ بے شبہ یورپ اس قسم کی جھوٹی اور
مکارانہ خوشامدوں کی مثالیں پیش کرسکتا ہے لیکن اسلام سے اس کی توقع نہیں
رکھنی چاہیے"۔(۹)

مولانا آزاد نے حاشیے میں یہ لکھ کر کہ گویا اعمال عالم گیر، اعمال نفس اسلام تھے (۱۰)، ایک طنز کیا ہے اور اسی بات کو ہمدانی صاحب نے زیادہ واضح طور پر لکھا ہے کہ دراصل یہ سمجھ صرف شبلی ہی کی نہیں بلکہ عام طور سے مورخین کی بھی ہے کہ اورنگ زیب نے کامل طور پر اسلام کی پیروی کی (۱۱)، حالاں کہ معاملہ محض یہ ہے کہ تاریخ نگاری میں اصل واقعہ اور استنباط نتائج دو علاحدہ چیزیں ہیں، علامہ شبلی نے اصل واقعہ یعنی شیواجی کے استقبال کا ذکر کرنے کے بعد استنباط نتائج میں "اسلام" کو پیش کیا ہے، وجہ ظاہر ہے اور سیاق وسباق بھی شہادت دیتے ہیں کہ مولانا شبلی انگریز مورخین جو ہندوستان میں عیسائیت کے علم بردار تھے، ان کا جواب دے رہے ہیں اور عیسائیت کے مقابلے میں شبلی اسلام ہی کو پیش کرسکتے تھے، اس سے اعمال عالم گیر اور نفس اسلام میں قدر مشترک پیدا کرنا نہ صرف مولانا شبلی کے ساتھ انصاف نہیں بلکہ تاریخی دیانت کے بھی خلاف ہے۔

سنبھا کی باغیانہ حرکتوں کے خلاف کاروائی ہوئی اور وہ گرفتار کیا گیا اور چوں کہ اس نے عالم گیر کو درودرشت گالیاں دیں، عالم گیر نے اس کی زبان کاٹنے کا حکم دیا اور پھر آنکھیں نکلوا کر قتل کرادیا، علامہ شبلی نے اسے عالم گیر کی پچاس سالہ حکومت میں ایک مستثنیٰ واقعہ قرار دیا ہے (۱۲)، مولانا آزاد نے اس پر جو حاشیہ لکھا ہے، وہ یہ ہے:

"اگرچہ عرق پوست پلا پلا کر زندانیان گوالیار کو ہلاک کرتا رہا، اسلام
نے تو ہر حال میں مثلہ کو ناجائز قرار دیا ہے لیکن یہ مقدس ولی مغلوب ومحکوم دشمن کی
زبان کٹواتا ہے اور آنکھیں نکلواتا ہے"۔ (۱۳)

علامہ شبلی نے زبان کٹوانے اور آنکھیں نکلوانے کے واقعہ کو وحشت ناکی کے لحاظ سے

ایک مستثنیٰ واقعہ قرار دیا ہے، یہ عام تعزیراتی عمل قطعی نہیں تھا، یہاں مثلہ کی بحث بھی بے جا ہے، مولانا آزاد نے یہاں بھی سنبھا کی سزا کو اسلام سے جوڑنے کی کوشش کی ہے، حالاں کہ علامہ شبلی نے یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ عالم گیر کی سلطنت میں پورے طور پر شریعت کے قوانین پر عمل کیا جاتا تھا، ہمدانی صاحب کو شکایت ہے کہ:

"شبلی عالم ہونے کے ساتھ نہ معلوم کیوں اورنگ زیب کے معاملہ
میں اپنے جذبات میں اس قدر بہہ جاتے ہیں کہ ان کو اورنگ زیب کا کوئی عمل
غیر شرعی محسوس نہیں ہوتا"۔ (۱۴)

یعنی شبلی کو جذبات پر قابو رکھتے ہوئے شرعی اور غیر شرعی کی بحث کرنی چاہیے تھی اور دکھلانا چاہیے تھا کہ عالم گیر کا کون سا فعل شریعت کے مطابق تھا اور کون غیر شرعی، یہ کس قدر عقل کے خلاف ہے کہ اولاً کسی واقعہ کو اسلام سے جوڑا جائے اور پھر یہ بے جا توقع کی جائے کہ شبلی کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔

سنبھا کے ساتھ اس کی ماں اور بیٹا ساہو بھی گرفتار ہوئے تھے قید میں ان کے ساتھ عالم گیر نے حسن سلوک سے کام لیا، ہفت ہزاری منصب اور راجہ کا خطاب دیا، اس کی سرکار قائم کی، اس کا خیمہ شاہی خیمے کے ساتھ ایستادہ کرایا، عالم گیر کے اس برتاؤ پر مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ "کیا اس سے الفنسٹن کے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوتی کہ عالم گیر نے مرہٹوں کے ساتھ بالآخر وہ کیا جو ان کی توقع سے بھی زیادہ تھا، اگر سخت مجبوری نہ ہوتی تو اس درجہ تالیف قلب ممکن نہ تھی۔ (۱۵)

سنبھا کو سخت سزا دی جائے تو مولانا آزاد چیں بہ جبیں اور ساہو کے ساتھ حسن سلوک ہو تو انگریز اور عیسائی مورخ الفنسٹن کی رائے کی تائید وتصدیق، اسے اعتراض برائے اعتراض کے علاوہ اور کیا نام دیا جاسکتا ہے۔

شاہ جہاں سے عالم گیر کی کسی بغاوت کا ذکر تاریخوں میں نہیں ملتا جس میں مراٹھوں نے عالم گیر کا ساتھ دیا ہو مگر ہمدانی صاحب نے اس کا انکشاف کیا ہے (جامعہ ص ۱۸۴)، حیرت ہے کہ اس کا ذکر برنیئر نے بھی نہیں کیا، کاش ہمدانی صاحب حوالہ دیتے تو مطالعہ عالم گیر کا ایک نیا باب شروع ہوتا۔

راجہ جسونت سنگھ نے کئی بار وفاداریاں تبدیل کیں اور ہر بار عفو و درگزر کی درخواست عالم گیر کے دربار میں منظور ہوئی، اس کی موت کے بعد راج پوتوں نے اس کے یک ماہہ بچے کو راجہ بنانے کی مانگ کی، عالم گیر نے جواب دیا کہ اس کو دربار میں بھیج دیا جائے، سن شعور کو پہنچنے کے بعد اس کو منصب وغیرہ دے دیا جائے گا لیکن راج پوتوں نے جواب کا انتظار تک نہ کیا اور بچے کو لے کر فرار ہو گئے، مولانا آزاد نے اس موقع پر یہ سوال قائم کیا ہے کہ "اگر کوئی مخالفانہ عزم وعمل عالم گیر کا نہ تھا تو کارپردازان جسونت سنگھ نے بچوں کو کیوں حوالہ نہیں کیا اور ابتدا سے مخالفانہ رویہ کیوں دکھلایا"۔(۱۶)

علامہ شبلی کے بہ قول کارپردازان جسونت سنگھ دربار عالم گیر کے جواب سے پہلے بچے کو لے کر فرار ہو گئے، ہمدانی صاحب کا کہنا ہے کہ عالم گیر نے جودھ پور کی گدی جسونت سنگھ کے بیٹے اجیت سنگھ کو دینے سے انکار کر دیا تھا، اس لیے راٹھوروں نے بغاوت کی اور مولانا شبلی پر یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ وہ تو حقائق کو اس طرح بیان کرتے ہیں جس سے دوسرا ہی قصوروار ٹھہرے۔(۱۷)

ممکن ہے علامہ شبلی کا بیان درست نہ ہو لیکن یہ تو طے ہے کہ بار بار کے عفو و درگزر کے باوجود راجہ جسونت سنگھ کی بیوی رانی ہاڈی اورنگ زیب مخالف تھی، اسے بہ قول ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد جودھ پور پر مغلوں کا تسلط تسلیم نہیں تھا اور وہ جودھ پور کو راٹھوروں کا وطن قرار دیتی تھی، اس لیے اس نے عالم گیر کی سپاہ اور امداد قبول نہیں کی(۱۸)، یہی وجہ تھی کہ عالم گیر نے اندر سنگھ کو جودھ پور سے ۳۶ لاکھ روپیہ لے کر ٹیکس وصول کرنے کا ٹھیکہ دے دیا، بعد میں اجیت سنگھ کو دو پرگنے سوجت اور جیتا کھ بہ طور جاگیر دیے(۱۹)، یہ بھی حقیقت ہے کہ عالم گیر نے ایک ماہہ بچے کو سن شعور تک پہونچنے کے بعد راجہ بنانے کی مانگ قبول کر لی تھی، علامہ شبلی نے اسی کو پیش نظر رکھ کر کارپردازان جسونت سنگھ کو قصوروار ٹھہرایا ہے، اس سے کہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ شبلی نے بالقصد حقائق کو دوسرے رنگ میں پیش کیا ہے۔

دارا شکوہ کے بارے میں علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ وہ علانیہ ہندوپن کا اظہار کرتا تھا، اُپنشد کے ترجمہ میں اس نے لکھا ہے کہ قرآن مجید اصل میں اُپنشد میں ہے(۲۰)، مولانا آزاد نے اس عبارت سے یہ مفہوم نکالا ہے کہ علامہ شبلی دارا شکوہ کو ملحد قرار دیتے ہیں، پھر اس پر یوں معترض

ہیں کہ "اس میں کیا الحاد ہے اگر اُپنشد سرچشمہ بحر توحید بہ قول دارا شکوہ ہے اور مطالب قرآن سے متحد تو یقینا و ما انزل من قبلک میں داخل ہے اور قرآن مثل توراۃ و انجیل اس کا مصداق"(۲۱) مگر مولانا آزاد کی یہ توجیہ خود ہی بہت محل نظر ہے، چاہے وہ دارا شکوہ کے نقطہ نظر کی کتنی ہی خوبصورت تاویل کیوں نہ ہو، اُپنشد کے ترجمہ دارا شکوہ کا ایک قلمی نسخہ ہمارے پیش نظر ہے جس کے سرورق پر ہندوانہ رسوم کا گہرا نقش ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ وحدت ادیان کے فلسفہ کو اس کے ذریعہ پیش کرنا چاہتا تھا، مولانا آزاد نے معلوم نہیں کن مجبوریوں کے تحت اس کے فلسفہ وحدت ادیان کو تورات و انجیل سے جوڑ دیا ہے۔

ہمدانی صاحب نے چند اور مثالیں بھی پیش کی ہیں اور دارا شکوہ کے متعلق محضر الحاد پر ایک عالم مولوی محمد یعقوب کے دستخط نہ کرنے اور ان کے اس قول سے کہ "مجھ کو دارا شکوہ کے الحاد کا علم نہیں"، مولانا آزاد کے موقف کی تائید کرنے کی کوشش کی ہے اور عہد عالم گیر کے علما پر عالم گیر کی ہم نوائی اور ماتحتی کا الزام عائد کیا ہے اور عالم گیر مخالف پشتو شاعر خوش حال خاں خٹک کے اشعار سے اس دور کے علما کی چاپ لوسی اور شریعت کے خلاف ان کی سرگرمیوں پر استدلال کیا ہے اور یہ سوال کیا ہے کہ دارا شکوہ کی تدفین مقبرہ ہمایوں میں ہوئی، کیا فتوی الحاد کے بعد ایک ملحد و مرتد کی تدفین مسلمانوں کے قبرستان میں شرعاً جائز تھی(۲۲)، حالاں کہ دارا کا قتل جیسا کہ معاصر تاریخوں کی شہادت سے سیاسی قتل تھا نہ کہ مذہبی(۲۳)، خود علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ:

> "تیموری خاندان بلکہ تمام ایشیائی سلطنتوں میں مدعیان سلطنت قید اور نظر بند ہو کر بھی سلطنت کے منصوبوں سے دست بردار نہیں ہوتے، اس کے ساتھ ان کے طرف داروں کا ایک گروہ ہمیشہ موجود رہتا ہے اور وہ اس وقت تک نچلا نہیں بیٹھ سکتا جب تک نخل آرزو کے تمام رگ و ریشے کٹ نہ جائیں...... یہ قطعی ہے کہ دارا شکوہ جب تک زندہ رہتا سازشیں برپا رہتیں اور ملک کو امن و امان نصیب نہ ہوتا، اس لیے عالم گیر کو وہی کرنا پڑا جو خود اس کے باپ شاہ جہاں سے اس کو ترکہ میں ملا تھا"۔(۲۴)

دارا شکوہ کے الحاد کے سلسلے میں علما اور مورخین کے درمیان اختلاف ممکن ہے مگر اس

کے علانیہ ہندوپن کے اظہار میں جیسا کہ خود علامہ شبلی نے لکھا ہے، کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا ہے، عام طور سے مورخین اس کا ذکر کرتے ہیں، منشی محمد ذکاء اللہ دہلوی لکھتے ہیں:

"داراشکوہ ہندوؤں کے دین اور آئین کی طرف مائل تھا، برہمنوں اور جوگیوں اور سنیاسیوں کے ساتھ صحبت رکھتا تھا اور ان کو مرشد کامل اور عارف حق واصل سمجھتا تھا اور ان کے وید کی کتاب کو آسمانی وخطاب ربانی جانتا تھا اور اس کو صحف قدیم وکتاب کریم خیال کرکے پڑھتا تھا اور کمال اعتقاد کے سبب سے اس نے اطراف سے سنیاسی اور برہمن بڑی سعی سے جمع کیے تھے اور وید کا ترجمہ کرتا تھا اور ہمیشہ اسی کام میں اپنے اوقات صرف کرتا تھا بجائے اسمائے حسنائے الٰہی کے پربھو جس کو ہندو اسم اعظم جانتے ہیں، ہندی خط میں الماس والیاقوت وزمرد وغیرہ کے نگینوں پر نقش کراکے پہنتا تھا اور ان کو متبرک جانتا تھا، وہ اس کا معتقد تھا کہ ناقصوں کے واسطے تکلیف عبادت ہے اور عارف کامل کو عبادت درکار نہیں اور اس کی دلیل آیت کریمہ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ اس کی دلیل بتلاتا تھا، اس لیے اس نے نماز، روزہ اور کل تکالیف شرعیہ کو خیر باد کہا"۔(۲۵)

جہاں تک داراشکوہ کے مقبرہ ہمایوں میں تدفین کا معاملہ ہے، اس سلسلہ میں اسلام کا جو موقف ہے وہ ظاہر ہے عالم گیر کو اگر اس کا علم ہوتا تو اس کی افتاد طبع کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ یقیناً دارا کی تدفین مقبرہ ہمایوں میں نہ ہوتی، اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ عالم گیر کا ہر عمل شریعت کے مطابق نہ تھا، علامہ شبلی نے بھی کہیں اس کا ذکر نہیں کیا ہے، باوجود اس کے ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ عالم گیر کے ہر فعل وعمل پر شرعی نقطہ نظر سے بحث کریں، کیا یہ تاریخی دیانت داری ہے۔

علامہ شبلی نے مراد کی گرفتاری اور پھر اس کی موت پر محققانہ اور مورخانہ انداز میں بحث کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اصل واقعہ یہ ہے کہ مراد گو نہایت دلیر، بہادر اور جاں باز تھا لیکن اس کے ساتھ نہایت سادہ لوح اور آسانی سے لوگوں کے دام میں آجاتا تھا، داراشکوہ پر جب اس کو فتح حاصل ہوچکی تو اب اس کو لوگوں کے بہکانے سے یہ خیال آیا کہ

یہ معرکے میں نے سر کیے ہیں، میں ہی تنہا تخت سلطنت کا حق دار ہوں، اس خیال سے اس نے عالم گیر سے علاحدگی اختیار کی اور عالم گیر کے بڑے بڑے امرا کو بھاری تنخواہوں اور انعاموں کی طمع دلاکر توڑنا شروع کیا، چنانچہ بیس ہزار فوج اس کے رکاب میں جمع ہوگئی اور روز بہ روز عالم گیر کی فوج گھٹتی جاتی تھی، مجبوراً عالم گیر کو اس کا بندوبست کرنا پڑا"۔(۲۶)

عالم گیر نے مراد کا جس طرح بندوبست کیا، خود علامہ شبلی کو بھی وہ پسند نہیں، وہ لکھتے ہیں:

"گو مراد سے علانیہ جنگ کرنے میں ہزاروں کا خون ہوتا لیکن اگر عالم گیر اور خوں ریزیوں کی طرح اس کو بھی گوارا کرتا اور مراد پر تدبیر سے نہیں بلکہ شمشیر سے قابو پاتا تو ہم اس کی مردانہ روش کی زیادہ داد دیتے لیکن سچ یہ ہے کہ عالم گیر نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خلیفہ منصور عباسی سے جس نے ابومسلم اصفہانی بانی دولت عباسیہ کو دھوکے سے قتل کرادیا تھا، زیادہ مدح کا مستحق ہے"۔(۲۷)

علامہ شبلی کی اس قدر وضاحت کے بعد بھی مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ:

تخت سلطنت کے لیے جو کشاکش شاہ جہاں کے بیٹوں کے درمیان واقع ہوئی، اس کی تفصیل شبلی نے مراد کی گرفتاری کا قصہ بیان کرکے ختم کردی ہے۔(۲۸)

ہمدانی صاحب مولانا آزاد کی حمایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ صحیح سوال آزاد نے اٹھایا ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ شبلی کے ذہن میں یہ بات رہی ہوگی کہ اگر ان معاملات کو چھیڑا تو پھر بات ہاتھ سے نکل جائے گی اور اورنگ زیب کی مدافعت نہ کر پائیں گے"۔(۲۹)

آخر وہ کون سے معاملات تھے جن کو شبلی چھیڑتے تو بات ہاتھ سے نکل جاتی، ہمدانی صاحب کم از کم اس کی ایک مثال تو پیش کردیتے، دعوا کے لیے ثبوت ضروری ہے۔

عالم گیر کے تعلق سے ایک اہم بحث جزیہ کی ہے، علامہ شبلی نے چوں کہ جزیہ پر علاحدہ ایک مفصل رسالہ لکھا تھا(۳۰)، اس لیے مختصراً لکھ دیا کہ جزیہ کوئی ناگوار چیز نہ تھی بلکہ غیر قوموں کے حق میں ایک رحمت تھی لیکن سچ ہے کہ ہندوؤں نے اس پر ناراضگی ظاہر کی، بات صرف اتنی تھی

کہ اس سے پہلے جزیہ اکبر نے موقوف کر دیا تھا، اس لیے دوبارہ اس کے نفاذ پر ناگواری کا اظہار ہوا (۳۱) جزیہ کی بحث پر مولانا آزاد نے شبلی کی جس بے اعتنائی کا شکوہ کیا وہ درست نہیں (۳۲) اس لیے کہ علامہ شبلی نے اس موقع پر صراحت کر دی ہے کہ جزیہ پر ایک مفصل رسالہ لکھا جا چکا ہے، اب ہمدانی صاحب کے خیالات ملاحظہ فرمائیں، وہ لکھتے ہیں:

"عجیب بات یہ ہے کہ شبلی دو اور اہم کتابوں کے بھی مصنف ہیں جن کا تعلق جزیے ہی سے ہے یعنی حقوق الذمیین اور الجزیہ، لیکن جب اورنگ زیب کی جزیہ کی پالیسی پر لکھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ ان کے پاس الفاظ ہی نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ شبلی نے جو کچھ ان دو کتابوں میں لکھا وہ اورنگ زیب کے اقدامات کے منافی تھا"۔(۳۳)

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ علامہ شبلی نے صراحت کر دی ہے کہ جزیہ پر ایک علاحدہ رسالہ لکھا جا چکا ہے، ہمدانی صاحب نے اس صراحت کا یہ مفہوم طے کیا ہے کہ شبلی کے پاس اورنگ زیب کی جزیہ کی پالیسی پر لکھنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں، پھر اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں، شبلی نے جو کچھ لکھا تھا وہ اورنگ زیب کے اقدامات کے منافی تھا، گویا شبلی نے شعوری طور پر صرف نظر کیا ہے، یہی مولانا آزاد کا بھی قیاس ہے، اس بحث میں بھی مرعوبیت کا عنصر غالب ہے۔

عالم گیر نے میلوں ٹھیلوں کو بند کرا دیا تھا، اس کا سبب بھی مورخین یورپ کو مذہبی تعصب ہی نظر آیا مگر علامہ شبلی نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ عالم گیر کا یہ عمل مذہبی تعصب کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس سے اخلاق پر برا اثر پڑتا تھا، نیز فساد و بلوہ وغیرہ کا بھی خطرہ رہتا تھا، اس لیے عالم گیر نے اسے بند کرا دیا، یہ محض علامہ شبلی کا اندیشہ ہی نہ تھا بلکہ انہوں نے اس کی یہ مثال بھی دی ہے کہ ۱۰۷۹ھ کے جلوس میں تابوت کے گشت کو لے کر برہان پور میں بلوہ عظیم ہوا، جس میں بڑی خوں ریزی ہوئی، چنانچہ عالم گیر نے تابوت نکالنے پر پابندی عائد کر دی، عالم گیر کی افتاد طبع کو بھی اس میں دخل تھا، وہ طبعاً خشک اور روکھا پھیکا شخص تھا، اسے میلوں ٹھیلوں، شراب، کباب، ناچ گانے اور ظاہری نمایش و تکلفات سے سخت نفرت تھی، غرض یہ کہ ان امور کی پابندی میں مذہبی تعصب کے بجائے نظم و انتظام کو دخل تھا۔(۳۴)

مولانا آزاد نے عالم گیر کی اس روش پر اعتراض کیا ہے کہ ہندوؤں کے مذہبی میلوں کو بند کرنے کا شرعاً و قانوناً اس کو کوئی حق نہ تھا، مذہبی اور اخلاقی اصلاح صرف مسلمانوں کے لیے تھی نہ کہ ذمیوں کے لیے (۳۵)، حالاں کہ ان اصلاحات کا تعلق نقض امن سے تھا اور کون انکار کر سکتا ہے کہ امن و امان کا قیام ہر فرماں روا اور ہر حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہوتی ہے، اس سلسلے میں مسلم اور ذمی کی بحث غیر ضروری اور غیر منطقی ہے۔

علامہ شبلی نے حقوق الذمیین میں اس پر بحث کی ہے، اس کے باوجود ہمدانی صاحب فرماتے ہیں کہ:

"شبلی بھی اپنی دوسری کتاب حقوق الذمیین میں یہی لکھتے ہیں کہ ذمیوں کو اپنے تیوہار وغیرہ منانے کی پوری پوری آزادی ہوگی، اس پر کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی جا سکتی، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ شبلی جب اورنگ زیب پر لکھتے ہیں تو وہ پیمانے ان کے سامنے نہیں رہتے کیوں کہ ان کے پاس اس کا کوئی جواز نہیں ہوتا تو پھر اس طرح کے بیانات دیتے ہیں تا کہ مسئلے کو ٹالا جا سکے اور جو مسلم قارئین اس کو پڑھیں گے تو ظاہر ہے وہ ایک عالم کی بات پر آمنا و صدقنا ہی کریں گے"۔(۳۶)

یہاں سرے سے ذمی اور غیر ذمی کی بحث ہی نہیں ہے بلکہ معاملہ محض امن و امان کے قیام کا ہے، ذمی کا معاملہ شبلی کے بجائے مولانا آزاد نے اٹھایا ہے، اس ستم ظریفی کو کیا کہا جائے کہ جس کا ذکر سارے فسانے میں نہیں تھا، وہ بات ہمدانی صاحب کو بہت ناگوار گزری ہے، دراصل ہمارے معترضین کا تاریخی شعور ناپختہ ہے، ورنہ وہ اس حقیقت کے اظہار و قبول میں دور دراز کی تاویلیں نہ کرتے۔

عالم گیر پر ایک بڑا الزام بت شکنی اور مندر توڑنے کا ہے، جس کی تشہیر مغربی مورخین نے اس زور سے کی کہ آج تک فضا پرشور ہے، علامہ شبلی نے اس اہم الزام کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اس نے ان ہی مندروں کو برباد کیا تھا، جہاں بغاوتوں کی سازشیں کی جاتی تھیں، مغربی مورخین اور ان کے زیر اثر بعض ہندوستانی مورخین نے اس سچائی کا رخ اس طرف موڑ دیا

کہ مندر توڑے گئے اس لیے بغاوتیں ہوئیں (۳۷)، جس کا ثبوت تاریخ سے نہیں ملتا (۳۸)، علامہ شبلی لکھتے ہیں:

"جس قدر بت خانے توڑے گئے ان ہی مقامات کے توڑے گئے جہاں پر زور بغاوتیں برپا ہوئیں، عالم گیر پچیس برس تک دکن میں رہا، ان ممالک میں ہزاروں بت خانے تھے لیکن کسی تاریخ میں ایک حرف بھی نہیں مل سکتا کہ اس نے کسی بت خانے کو ہاتھ بھی لگایا ہو، الورہ کے مشہور مندر میں سینکڑوں تصویریں اور بت ہیں، عالم گیر اسی نواح میں میل دو میل کے فاصلے پر مدفون ہے، بڑے بڑے بزرگان دین کا یہاں مزار ہے جو عالم گیر سے بہت پہلے گزرے ہیں لیکن یہ بت اور تصویریں آج تک موجود ہیں"۔(۳۹)

علامہ شبلی نے اس سلسلہ میں جو ناقابل تردید دلائل بیان کیے ہیں، دور حاضر کے بعض اہم مورخین نے بھی ان کی صداقت کو تسلیم کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ عالم گیر نے صرف مندر ہی نہیں توڑے بلکہ بغاوتوں کی زد میں آنے والی مساجد بھی مسمار کیں (۴۰) لیکن ہمدانی صاحب فرماتے ہیں:

"ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شبلی عہد اورنگ زیب کے ماخذ کا مطالعہ کیے بغیر صرف اورنگ زیب کے ہر قدم کو صحیح ثابت کرنے کے لیے دلائل پیش کرتے رہے ہیں، دوسرے ان بیانات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شبلی کے ذہن میں عہد اورنگ زیب کی تاریخ وار ترتیب ہے ہی نہیں، بغاوت بعد میں ہوئی مندر پہلے توڑا گیا"۔(۴۱)

علامہ شبلی اپنے موقف کی تائید میں دلائل پیش کرتے ہیں، حوالے دیتے ہیں، ظاہر ہے یہ بغیر ماخذ کے مطالعے کے ممکن نہیں، پھر بھی ہمدانی صاحب کو محسوس ہوتا ہے کہ شبلی عہد اورنگ زیب کے ماخذ کا مطالعہ کیے بغیر اورنگ زیب کے ہر قدم کو صحیح ٹھہراتے ہیں تو ان کے احساس کو کون سا نام دیا جائے اور خود ہمدانی صاحب اپنے کو دلائل و براہین سے بالاتر سمجھتے ہیں اور کوئی حوالہ نہیں دیتے اور نہ مثال پیش کرتے ہیں محض الزامات عائد کرتے ہیں، یہ تاریخ اور تجزیہ کا

طریقہ نہیں بلکہ غیر علمی اور غیر مورخانہ انداز تحریر ہے جسے کسی طرح درست نہیں قرار دیا جا سکتا۔

مولانا آزاد نے ایک دو جگہ واضح طور پر علامہ شبلی کی تاریخ نگاری پر تنقید کی ہے، مثلاً علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ داراشکوہ نے یہ مشق بہم پہنچائی تھی کہ شاہ جہاں کے خط سے اپنا خط ملا دیتا تھا اور فرامین پر شاہ جہاں کے دستخط اپنے ہاتھ سے بناتا تھا (۴۲)، اس کے حاشیہ میں مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ "کیا منصفانہ تاریخ نویسی ہے کہ مراد جو خود ایک فریق ہے اور داراشکوہ کا دشمن اس کے قول کی سند لائی جاتی ہے (۴۳)"، علامہ شبلی کو بھی اس کا احساس تھا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"ان موقعوں پر مراد کا بیان اس لیے نہایت وثوق کے قابل ہے کہ وہ یہ واقعات عالم گیر کو لکھ رہا ہے، اس لیے یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ عوام کو دھوکا دینے کے لیے لکھتا ہو، مراد اور عالم گیر اس وقت تک ہم راز اور ہم درد ہیں"۔(۴۴)

اب اس سلسلے میں ہمدانی صاحب کا خیال ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں:

"ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شبلی نے شاہ جہاں کے دور کے کسی ایک فرمان کو بھی نہیں دیکھا، فرامین پر مغل بادشاہ دستخط نہیں کرتے تھے اور نہ کسی فرمان پر ان کے دستخط ملتے ہیں، وہ صرف ایک صواد (؟) بناتے تھے، لہٰذا یہ الزام ہی سرے سے قطعی غلط ہے، مغل بادشاہوں کے دستخط تو بہت کم ملتے ہیں اور وہ بھی خاص مخطوطات پر"۔(۴۵)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر مغلوں کے فرامین کی پہچان کیا تھا اور کیسے تسلیم کیا جاتا تھا کہ یہ شاہی فرمان ہے، ہمدانی صاحب فرماتے ہیں کہ محض صاد بنا دیا جاتا تھا ممکن ہے مراد نے اسی کو دستخط خیال کیا ہو۔

دارا کے خط میں خط ملا دینے کا ذکر متعدد مورخوں نے کیا ہے، رقعات و مکاتیب عالم گیر کے سب سے بڑے ماہر پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی نے بھی دارا کی اس حرکت کا ذکر کیا ہے (۴۶) اور اس بات پر تمام مورخین متفق ہیں کہ شاہ جہاں کی بیماری کے بعد سارے اختیارات دارا نے اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے اور بہت سے ایسے واقعات ہیں کہ شاہ جہاں کی رائے کے برخلاف دارا نے فیصلے کیے اور فرمان جاری کیے، اس کی خودسری اور خودرائی سے بھی بعید نہیں کہ اس نے

یہ حرکت کی ہو۔

جہاں تک مولانا شبلی کے فرامین دیکھنے کا معاملہ ہے، یقیناً انہوں نے فرامین دیکھے تھے بلکہ بعض فرامین کی نمائش بھی کی تھی، عہد مغلیہ کے چند فرامین دارالمصنفین میں بھی موجود ہیں، رہا معاملہ ان سے استدلال کا تو اس کی وجہ جیسا کہ اوپر درج کیا گیا علامہ شبلی نے خود ہی بیان کردی ہے، اس کے باوجود اعتراض چہ معنی دارد۔

علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ عالم گیر فن موسیقی کا ماہر تھا لیکن چوں کہ مزامیر کے ساتھ گانا بجانا شرعاً ممنوع ہے، اس لیے اس نے اس صیغہ کو بند کردیا، مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ کس شریعت میں ممنوع ہے، اسلام میں تو نہیں۔

یہاں یہ سوال قائم کیا جاسکتا ہے کہ شریعت کی بحث خود علامہ شبلی نے اٹھائی ہے، جس کے جواب میں مولانا آزاد نے ایک اور مسئلہ اٹھادیا ہے کہ موسیقی کس شریعت میں ممنوع ہے، اسلام میں تو نہیں ہے، اس کے جواز وعدم جواز کا فیصلہ علما کی ذمہ داری ہے تاہم واقعہ یہ ہے کہ یہاں شریعت کا حوالہ مولانا شبلی نے دیا ہے۔

دراصل الزامات عالم گیر کی تردید میں عہد و ماحول کا خیال رکھنا ضروری ہے، عالم گیر کا ابتدائی دور معرکہ آرائیوں میں گزرا اور جب اسے استحکام نصیب ہوا تو اس نے شریعت کے قوانین پر عمل درآمد کی کوشش کی، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن اس کے ہر فعل وعمل کو شریعت کی میزان پر تولا بھی نہیں جاسکتا۔

دراصل مولانا آزاد کا ایک خاص نقطہ نظر تھا اور ان کی سیاسی مجبوریوں نے ان کے اس مطمح نظر کو جواز فراہم کرنے کی کوشش کی، علامہ شبلی پر ان کے اعتراضات کے جائزے میں اس مجبوری کا ادراک نامناسب نہیں لیکن ہمدانی صاحب شاید اس پس منظر سے ناواقف ہونے کی وجہ سے آزاد کے خیالات کے ہم نوا ہیں، حالاں کہ تمام تاریخی شہادتیں مولانا آزاد کے موقف کے خلاف ہیں۔

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے لکھا ہے کہ اورنگ زیب کے عہد سے متعلق بعد میں جو دستاویزات ملی ہیں اور جو اس وقت انہیں (علامہ شبلی کو) حاصل نہیں تھیں، ان کی بنیاد پر کئی باتوں

میں ان کی تردید کی جاسکتی ہے (۴۷) مگر وہ کوئی دستاویز پیش نہیں کرسکے، اس لیے ان کا بیان علمی حیثیت سے باوزن نہیں، اس کے برعکس دور حاضر کے مورخین نے جو کچھ لکھا ہے اس سے نہ صرف علامہ شبلی کے دلائل کی صداقت واضح ہوتی ہے بلکہ مزید دلائل بھی فراہم ہوتے ہیں۔(۴۸)

کسی کتاب اور مقالے پر بحث وتنقید میں اس کے عہد اور زمانہ تصنیف کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے، علامہ شبلی نے جس وقت یہ مضامین لکھے تھے اس وقت اس موضوع پر کسی ہندوستانی مورخ اور صاحب علم ونظر کی کوئی تحریر موجود نہیں تھی، ہمدانی صاحب نے اس کی اولیت اور اہمیت کا کہیں اعتراف نہیں کیا ہے۔

علامہ شبلی نے تاریخ نویسی میں سند اور حوالے پر بہت زور دیا ہے اور خود اس کا بہت اہتمام کیا ہے، بعض ان مقامات پر بھی حوالے دیے ہیں جہاں اگر وہ حوالے نہ بھی دیتے تو ان کے علم وفضل اور مورخانہ عظمت کی وجہ سے کوئی معترض نہ ہوتا لیکن ہمدانی صاحب اس دور جدید میں بھی خود کو اس سے بالاتر تصور کرتے ہیں، پورے مقالے میں کہیں بھی حوالہ نہ دینا کیا ظاہر کرتا ہے، علامہ شبلی تو جن کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں ان کے پایہ استناد پر بھی بحث کردیتے ہیں اور ہمدانی صاحب ان پر تنقید کرتے ہیں اور حوالہ تک نہیں دیتے۔

حوالے

(۱) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ص ۳، دارالمصنفین اعظم گڈھ، طبع جدید ۱۹۹۹ء (۲) جامعہ دہلی، اپریل، جون ۲۰۰۵ء، ص ۱۸۰ (۳) شبلی کی علمی وادبی خدمات، ص ۲۹۸، ڈاکٹر خلیق انجم، انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۹۶ء (۴) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ص ۷۵ (۵) ایضاً، ص ۸۵ (۶) ایضاً، ص ۴۵ (۷) جامعہ دہلی، اپریل، جون ۲۰۰۵ء، ص ۱۸۱ (۸) ایضاً (۹) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ص ۲۷ (۱۰) حواشی ابوالکلام آزاد، ص ۳۴۸، دہلی ۱۹۸۸ء (۱۱) جامعہ دہلی، اپریل، جون ۲۰۰۵ء، ص ۱۸۲ (۱۲) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ص ۳۸ (۱۳) حواشی ابوالکلام آزاد، ص ۳۴۸-۳۴۹ (۱۴) جامعہ دہلی، اپریل، جون ۲۰۰۵ء، ص ۱۸۳ (۱۵) حواشی ابوالکلام آزاد، ص ۳۴۸-۳۴۹ (۱۶) ایضاً، ص ۳۵۰ (۱۷) جامعہ دہلی، اپریل، جون ۲۰۰۵ء، ص ۱۸۴-۱۸۵ (۱۸) ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد، اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر، ص ۵۴، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۰ء (۱۹) ایضاً، ص ۵۵ (۲۰) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ص ۶۲

(۲۱) حواشی ابوالکلام آزاد، ص ۳۵۰ (۲۲) جامعہ دہلی، اپریل، جون ۲۰۰۵ء، ص ۱۸۶ (۲۳) عالم گیر نامہ، ص ۳۳-۴۳ و مآثر عالم گیری، ص ۲۷ (۲۴) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ص ۹۲-۹۳ (۲۵) تاریخ ہندوستان، ج ۸، ص ۷ و ۸، علی گڑھ، ۱۹۱۷ء (۲۶) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر ص ۹۵ (۲۷) ایضاً ص ۹۶ (۲۸) حواشی ابوالکلام آزاد، ص ۳۵۲ (۲۹) جامعہ دہلی، اپریل، جون ۲۰۰۵ء، ص ۱۹۱ (۳۰) مقالات شبلی ج ۱، ص ۲۲۱، دارالمصنفین اعظم گڈھ، ۱۹۵۴ء (۳۱) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر ص ۶۷ (۳۲) حواشی ابوالکلام آزاد، ص ۳۵۰ (۳۳) جامعہ دہلی، اپریل، جون ۲۰۰۵ء، ص ۱۸۸ (۳۴) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ص ۶۷-۶۸ (۳۵) حواشی ابوالکلام آزاد، ص ۳۵۱ (۳۶) جامعہ دہلی، اپریل، جون ۲۰۰۵ء، ص ۱۸۹ (۳۷) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ص ۷۳ (۳۸) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مولانا ریاست علی ندوی، "عالم گیر کے عہد میں مندروں کا انہدام" (معارف فروری ۱۹۴۷ء) (۳۹) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ص ۷۳ (۴۰) اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر، ص ۱۷ (۴۱) جامعہ دہلی، اپریل، جون ۲۰۰۵ء، ص ۱۸۹ (۴۲) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ص ۸۳ (۴۳) حواشی ابوالکلام آزاد، ص **۳۵۶** (۴۴) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ص ۸۳ (۴۵) جامعہ دہلی، اپریل، جون ۲۰۰۵ء، ص ۱۹۰ (۴۶) سید نجیب اشرف ندوی، مقدمہ رقعات عالم گیر، ص ۴۱۰، دارالمصنفین اعظم گڈھ، ۱۹۹۳ء (۴۷) ضیاء الحسن فاروقی، اشخاص و افکار، ص ۴۷، دہلی (۴۸) اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر، ص ۵۔

ڈاکٹر نجم الاسلام کے نام

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے چند غیر مطبوعہ خطوط

از:- جناب رفیق احمد خاں صاحب☆

(۲)

(سلسلے کے لیے معارف ماہ مئی ۲۰۰۶ء ملاحظہ ہو)

۱

عزیز گرامی   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ (۱)

محترم ڈاکٹر نذیر احمد صاحب (۲) کا مضمون خوب ہے، دوسرا تاثراتی مضمون شائع کرنے کے لائق نہیں، ان صاحب (۳) کو کوئی جواب نہ دیں، تاثراتی مضمون (ہو سکے تو ہاشمی صاحب (۴) کا) شائع کر دیں، ورنہ انہیں ملال ہوگا، یہ ہو سکتا ہے کہ ہاشمی صاحب کے مضمون میں میرے قلم سے ترمیم ہو جائے تو پھر ان کو شکایت نہ رہے گی، غالباً تاثراتی مضمون کوئی اور نہیں ہوگا، عفت بانو کے مضمون میں ترمیم کر دی گئی تھی۔ (۵)

بزرگوں کے خطوط روانہ کرتا ہوں (عکس کے لیے)۔ (۶)

حیات باقیؒ ہی نام رکھ دیں، یعنی باقیات باقیؒ کے صفحات ۱ تا ۲۱ لے لیں اور اگر گنجائش ہو تو صفحہ ۲۱ کے اکبری الحاد سے صفحہ ۳۴ تک لے لیں (۷) لیکن طوالت کا خوف ہے۔

فقط والسلام

احقر (دست خط)

☆ شعبہ اردو، سندھ یونی ورسٹی، جامشورو، پاکستان۔

۲

عزیز گرامی   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ (۱)

ڈاکٹر مختار الدین صاحب اور ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کے خط واپس کرتا ہوں۔ (۲)

آج سے ۳۰/۳۵ سال قبل ایک مضمون لکھا تھا، اب تو اتنا دماغ بھی نہیں کہ وہ کس کے متعلق تھا، آپ ایک نظر دیکھ لیں اور اپنی طرف سے (ترمیم کے ساتھ) شائع فرمادیں، اگر مناسب ہو (میری طرف سے نہیں)۔

فقط والسلام

احقر (دست خط)

۳

باسمہ حامداً ومصلیاً

۲۱ رمئی ......

عزیز محترم   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ (۱)

آج ڈاکٹر مختار الدین صاحب کو خط لکھ دیا ہے، محترم ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کو بھی سلام وپیام لکھ دیا ہے۔

آپ نے صفیہ (۲) کی اس قدر ہمت افزائی فرمائی، پہلے سمسٹر کا امتحان اس نے دیا ہے، اب وہ جدہ میں ہے، دوسرے سمسٹر کا کیا انتظام ہوگا؟ فائنل میں مقالہ کی کیا صورت ہوگی؟ میرے پاس ایک شاعر طرفہ کا کلام ہے، ۶۰-۷۰ غزلیں ہیں، ان پر مقدمہ اور کلام کی تدوین کافی ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اب میری صحت ٹھیک نہیں رہتی۔

فقط والسلام

احقر (دست خط)

۴

عزیز مکرم   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تذکرہ اشارات بینش سے اپنے مضمون (۱) کے لیے کوئی خاص اضافہ نہیں کیا جاسکتا،

آپ بھی ملاحظہ فرمالیں۔

اپنے مضمون (صفحہ ۳۳) کی سطر ۴ میں محمد انور پر نمبر ڈال کر اتنا لکھ سکتے ہیں کہ ”ان کے اخلاف میں حافظ محمد انوار الحق (فاروقی) متخلص انوار فارسی کے اچھے شاعر تھے، ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے، جیسا کہ تذکرہ اشارات بینش (دہلی ۱۹۷۳ء) کے صفحہ ۴۶ میں ذکر ہے اور یہ کہ وہ ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء تک ضرور زندہ تھے، جب کہ وہ تذکرہ لکھا جارہا تھا، حضرت شاہ غلام علی (م ۱۲۴۰ھ) کے خلیفہ شاہ عبدالرحمٰنؒ کے مرید تھے“، ارکاٹ (اور مدراس) کا خاندان والا جاہی، انوار ہی کا خاندان تھا۔

فقط والسلام

احقر (دست خط)

۵

عزیز مکرم   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ (۱)

مضمون ”دیوان احمد جام کے بعض سنین“ (۲) ارسال خدمت ہے، دیوان عبدالقادر جیلانی (۳) والے مضمون میں (دوسرے صفحے میں) کمال خجندی کا سال وفات نہیں لکھا تھا، اب معلوم ہوا (م ۸۰۳ھ/۱۴۰۰ء) اس کے نام کے ساتھ تحریر فرمادیں۔

فقط والسلام

احقر (دست خط)

۶

عزیز گرامی   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ (۱)

کل میں نے مضمون ”دیوان احمد جام کے بعض سنین“ خدمت میں بھیجا تھا، اب دماغ عجیب ہوگیا ہے، اس مضمون کا صحیح عنوان ”دیوان احمد جام کا ایک جائزہ“ (۲) ہونا چاہیے تھا، چکر بہت آتے ہیں سرگرم ہوجاتا ہے، دعائیں یاد رکھیں۔

فقط والسلام

احقر (دست خط)

۷

عزیز گرامی ڈاکٹر صاحب دام مجدکم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

محترم ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب (۱) نے دو ورق پڑھنے کو بھیجے ہیں، خود انہوں نے پڑھنے کی کوشش کی ہے لیکن مجھ سے اب تو کچھ نہیں ہوتا، آنکھیں بھی بہت کمزور ہو گئی ہیں، ازراہ کرم پڑھ کر کرم فرمائیں۔ (۲)

فقط والسلام

احقر (دست خط)

۸

۱۲ر جولائی ۱۹۹۷ء باسمہ حامداً ومصلیاً

عزیز گرامی منزلت دام مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ (۱)

عرصے سے جی چاہ رہا ہے کہ آپ کے متعلق تفصیل سے مضمون لکھوں لیکن اب دماغ صحیح نہیں رہتا، آپ کے خاندانی حالات، میرٹھ کے اعزا، اقربا، وہاں کی تعلیم کا زمانہ، والد صاحب اور بزرگوں کے حالات، میرٹھ میں اساتذہ، وہاں سے جو رسالہ آپ نے شائع کیا تھا، فارسی، عربی وغیرہ کی تعلیم و تعلم، پھر وہاں سے پاکستان کب تشریف لائے؟ سکھر میں کیوں اور کب تک کس ادارے سے تعلق رکھا، سندھ یونی ورسٹی کس سال تشریف لائے؟ یہاں کے الات، یہاں کے عزیزوں سے تعلقات، احباب سے تعلقات، کون کون سی کتابیں شائع کیں؟ کون سی زیر ترتیب ہیں؟ مجھے تو اس قدر بھی اب صلاحیت نہیں کہ تحقیق کے لیے جو کچھ آپ نے لکھا یا لکھوایا ہے اس کو ترتیب دے سکوں، بہر حال آپ یہ حالات میری طرف سے مفصل لکھ دیں تو مجھ پر احسان ہوگا، جو باتیں آپ کے احسانات سے متعلق ہیں انشاء اللہ سوچ کر اضافہ کرنے کی کوشش کروں گا، بہر حال جس قدر مفصل ہو بہتر ہوگا، اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت باکرامت رکھے، آمین ثم آمین۔

فقط والسلام

احقر (دست خط)

حواشی وتعلیقات

۱۔ مکتوبات ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، مرتبہ خالد محمود، طبع اول، ج ۱، حیدرآباد سندھ، زبیر پبلی کیشنز ۱۹۹۷ء۔

۲۔عفت بانو نے اپنے مضمون ''حالات زندگی'' میں ڈاکٹر صاحب کی تاریخ پیدائش ۲۳ر ستمبر ۱۹۱۲ء لکھی ہے، (دیکھیے رسالہ تحقیق، شمارہ ۴، شعبہ اردو، جامعہ سندھ ۱۹۹۰ء (جب کہ ڈاکٹر نجم الاسلام نے اپنے مضمون ''ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا مقالہ تحقیق'' سید حسن غزنوی'' میں پیدائش ۱۲ر اگست ۱۹۱۲ء لکھی ہے (دیکھیے ایضاً) ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اپنی ملازمت کی توسیعی مدت بھی پوری کرکے متقاعد ہوگئے تھے، اسی سال کسی ضرورت کے تحت ڈاکٹر صاحب کی خدمات کا خاکہ ڈاکٹر نجم الاسلام نے ترتیب دیا تھا، اس میں تاریخ پیدائش یکم جولائی ۱۹۱۲ء درج کی گئی تھی، رسالہ نئی عبارت حیدرآباد سندھ کے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نمبر میں ۲۳ر ستمبر ۱۹۱۲ء شائع ہوئی ہے، اگرچہ یہ تینوں تحریریں ڈاکٹر صاحب کی نظر سے گزر چکی تھیں تاہم کیا وجہ رہی کہ درست اور صحیح تاریخ کا تعین نہیں ہو سکا، حیدرآباد سندھ سے معروف صحافی ظہیر احمد کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے ''تحریر وتصویر'' کے تازہ شمارہ ۷، اکتوبر ونومبر ۲۰۰۵ء میں مدیر رسالہ نے اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے ایک بائیو ڈیٹا کا تذکرہ کیا ہے جس کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ یہ بائیو ڈیٹا ڈاکٹر صاحب نے اپنے ہاتھ سے تحریر کیا اور دست خط کیے، اس بائیو ڈیٹا کے مطابق ڈاکٹر صاحب نے خود اپنی تاریخ پیدائش یکم جولائی ۱۹۱۲ء تحریر کی ہے، یقیناً اب درست تاریخ کا تعین ڈاکٹر صاحب کے اصل دست آویز ہی سے کیا جا سکتا ہے، پیش نظر صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے یکم جولائی ۱۹۱۲ء کو درست کہا جا سکتا ہے، چنانچہ وہی تاریخ درج کی گئی ہے۔ ۳۔حالات زندگی (ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں) از عفت بانو، رسالہ تحقیق شمارہ ۴، شعبہ اردو سندھ یونی ورسٹی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۔ ۴۔ڈاکٹر نجم الاسلام نے اپنے بائیو ڈیٹا میں تجربے کے ذیل میں Oriental College Sukkur لکھا ہے، دیکھیے ''ڈاکٹر نجم الاسلام ایک شخص ایک عہد'' مرتبین عتیق احمد جیلانی ورفیق احمد خاں، حیدرآباد، سندھ، ادارۂ انشاء، مارچ ۲۰۰۲ء، ص ۴۱۷۔ ۵۔بدر فاروقی مرحوم کا ڈاکٹر نجم الاسلام سے دہرا رشتہ تھا، رشتے کے بھائی ہونے کے علاوہ وہ ان کے برادر نسبتی بھی تھے جب کہ ''معیار'' میرٹھ کے ''خصوصی نمبر'' فروری ۱۹۵۶ء پر مدیر رسالہ کی حیثیت سے نجم الاسلام کے ساتھ بدر فاروقی کا نام بھی درج ہے، وہ ادارۂ علمی حیدرآباد، سندھ کے صدر رہتے، ماہ نامہ ''معیار'' میرٹھ کے تنقید نمبر (۱۹۵۴) کا اجرائے ثانی (۱۹۹۵) ان ہی کی جانب سے ہوا تھا۔ ۶۔راقم کے نام ڈاکٹر نجم الاسلام کے دیرینہ دوست زبیر بن عمر صاحب کا مکتوب محررہ ۷ر مئی ۲۰۰۲ء۔ ۷۔''ڈاکٹر نجم الاسلام'' مشمولہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے نامور شاگردوں کی ادبی خدمات کا جائزہ از نازنین سلیم، ڈاکٹر نجم الاسلام نمبر (حصہ ۱) سہ ماہی انشاء، حیدرآباد سندھ، جنوری تا مارچ ۲۰۰۲ء، اس حوالے سے زبیر بن عمر صاحب لکھتے ہیں ''نجم الاسلام صاحب ہندوستان سے انگریزی میں ایم اے کا ایک سال مکمل کرکے پاکستان آئے تھے، میرٹھ کالج شمالی ہندوستان کا ایک منفرد تعلیمی ادارہ تھا جس کا شعبہ انگریزی بہت

معروف تھا، وہاں سے پروفیسر کرار حسین اور محمد حسن عسکری جیسی شخصیتوں کا تعلق رہا تھا...... نجم صاحب نے اسی میرٹھ کالج سے انگریزی ادب میں ڈگری لینے کا پروگرام بنایا تھا لیکن پاکستان آنے کے بعد ان کا ارادہ بدل گیا''، مکتوب بہ نام راقم محررہ ۱۷ رمئی ۲۰۰۲ء۔ ۸- دیکھیے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا مضمون'' آہ میرے نجم الاسلام'' مشمولہ سہ ماہی انشاء، حیدرآباد سندھ، شمارہ ۲۹ رجنوری تا مارچ ۲۰۰۱ء، ڈاکٹر سردار احمد خاں کا مضمون'' نجم الاسلام صاحب: چند یادیں چند خطوط''، ڈاکٹر نجم الاسلام نمبر (حصہ ۱) سہ ماہی انشاء حیدرآباد سندھ۔ ۹- ڈاکٹر نجم الاسلام نے محترمہ نازنین سلیم کو ان کے مقالے'' ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے نام ور شاگردوں کی ادبی خدمات کا جائزہ'' کے لیے بہ حیثیت شاگرد اپنے آپ سے تعلق معلومات فراہم کیں، یہ عبارت اسی کا حصہ ہے، اقتباس کا جزو آخر، وہ اپنے مقالے میں ایک مقام پر نقل کر چکی ہیں، مقالے کا یہ حصہ سہ ماہی انشاء کے'' ڈاکٹر نجم الاسلام نمبر'' (حصہ ۱) میں شائع ہو چکا ہے، مذکورہ اقتباس دیکھیے'' ڈاکٹر نجم الاسلام نمبر'' (حصہ ۱) ص ۱۶۳ پر۔ ۱۰- دیکھیے ذاتی کوائف نامہ (BIO-DATA)، مشمولہ'' ڈاکٹر نجم الاسلام ایک شخص ایک عہد'' مرتبین عتیق احمد جیلانی و رفیق احمد خاں، ادارۂ انشاء حیدرآباد، سندھ، مارچ ۲۰۰۲ء، ص ۱۷-۴۱۔ ۱۱-'' ڈاکٹر نجم الاسلام'' مشمولہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے نام ور شاگردوں کی ادبی خدمات کا جائزہ، از نازنین سلیم، محولہ بالا، ص ۱۶۲۔ ۱۲- ایضاً، ص ۱۶۳۔ ۱۳-'' آہ میرے نجم الاسلام''، ص ۲۶۔ ۱۴- دیکھیے (الف) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے نام ڈاکٹر نجم الاسلام کے خطوط، مشمولہ'' یادگار خطوط، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے نام'' مرتبہ خالد محمود اور'' مکتوبات نجم الاسلام بہ نام ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں''، مشمولہ'' گوشۂ نجم الاسلام'' سہ ماہی انشاء، شمارہ ۲۹، جنوری تا مارچ ۲۰۰۱ء، (ب)'' آں کہ من دانم و داند دل من'' از ڈاکٹر نجم الاسلام، ماہ نامہ قومی زبان، کراچی، مارچ ۱۹۸۸ء۔ ۱۵- رسالہ'' تحقیق'' شمارہ ۱، ۱۹۸۷ء، شعبہ اردو سندھ یونی ورسٹی۔ ۱۶-'' آں کہ من دانم و داند دل من'' از ڈاکٹر نجم الاسلام، ماہ نامہ قومی زبان، کراچی، مارچ ۱۹۸۸ء۔ ۱۷- سراج البیان، از ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، کراچی، گابا سنز، ۱۹۹۲ء۔ ۱۸- تقدیمات، رسالہ تحقیق شمارۂ خاص ۱۱-۱۰، شعبہ اردو سندھ یونی ورسٹی، ۹۷-۱۹۹۶ء۔ ۱۹- حاشیہ، مکتوبات ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ص ۳۶۵۔ ۲۰- ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا مکتوب بہ نام ڈاکٹر نجم الاسلام، مکتوبات ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ص ۳۷۷۔ ۲۱-'' آہ میرے نجم الاسلام'' ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں۔ ۲۲- ایضاً۔

خط نمبر ۱: (۱) یہ رقعہ سادے کاغذ پر تحریر کیا گیا ہے'' تحقیق'' شمارہ ۴،'' گوشۂ تہنیت: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں (احوال و آثار)'' سے متعلق معلوم ہوتا ہے، اس رقعے پر تاریخ درج نہیں ہے، اس پر ڈاکٹر نجم الاسلام کے اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲ راگست ۱۹۹۰ء کا لکھا ہوا ہے۔ (۲) ڈاکٹر نذیر احمد (پ: ۳ رجنوری 1915ء ضلع گونڈا، اترپردیش) ۱۹۷۷ء میں دو سال کی توسیع کے بعد شعبۂ فارسی کی سترہ سالہ سربراہی سے سبک دوش

ہوئے، اب وہ علی گڑھ میں علمی و ادبی کاموں میں بہ دستور معروف ہیں، ان کا ایک مضمون'' سفینۂ نزہۃ المجالس'' بہ طور خاص'' گوشۂ تہنیت: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں (احوال و آثار)''،'' تحقیق''، شمارہ ۴، ۱۹۹۰ء کی مناسبت سے موصول ہوا تھا، جب کہ دوسرا مضمون'' خاندان جیہانی'' مدیر رسالہ کی درخواست پر ارسال کیا گیا، دیکھیے'' اداریہ'' مدیر (ڈاکٹر نجم الاسلام)'' تحقیق'' شمارہ ۴، ثانی الذکر مضمون بھی مذکورہ شمارے کی زینت بنا۔ (۳) یہ اشارہ ڈاکٹر عطاء الرحیم، صاحب سابق استاذ، شعبۂ فلسفہ سندھ یونی ورسٹی کی جانب ہے۔ (۴) اس گوشے میں تاثراتی مضمون ایک ہے اور وہ ہے ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق صاحب (سابق پروفیسر اردو فارسی، ناگ پور یونی ورسٹی) کا، ہاشمی صاحب نامی کسی شخص کا کوئی مضمون جملہ مضامین میں نہیں ہے، ممکن ہے یہ التباس ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کے نام کے سبب سے ہوا ہو۔ (۵) شعبۂ اردو سندھ یونی ورسٹی سے ایم-اے (اردو) میں پوزیشن حاصل کی، استاد: پی ای سی ایچ ایس گرلز کالج، کراچی'' تحقیق'' شمارہ ۴، میں ان کا مضمون'' حالات زندگی'' (غلام مصطفیٰ خاں صاحب) کے عنوان سے نکلا ہے۔ (۶) یہ وہی بزرگ ہیں جن کے خطوط ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے نام'' گوشۂ تہنیت: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں (احوال و آثار)'' میں شائع ہوئے اور جن کا تذکرہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے مذکورہ مکتوب کے زیریں حصے میں ڈاکٹر نجم الاسلام نے اپنے قلم سے کیا ہے، مکتوب الیہم کی اس مرقومہ فہرست میں محمود شیرانی، ضیاء احمد بدایونی اور ڈاکٹر مختار الدین احمد کے نام نہیں ہیں جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ تحقیق شمارہ ۴ میں جن مشاہیر کے عکسی خطوط شامل اشاعت کیے گئے ہیں ان میں ان حضرات کے نام درج ہیں۔ (۷) غالباً اسے بہ طور عکس تحریر شائع کرنے کا ارادہ تھا مگر طوالت کے خوف نے اجازت نہیں دی، چنانچہ پیش نظر مکتوب میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کے قلم سے یہ عبارت نکلی'' لیکن طوالت کا خوف ہے''۔

خط نمبر ۲: (۱) اس رقعے کا سائز "2"X5 ہے، اس پر تاریخ درج نہیں، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کے اپنے خط میں کوئی پونے دو صفحے کا ایک مضمون بھی منسلک ہے، بہ صورت عکس، مذکورہ مضمون ہی کی پشت پر رقعے کا عکس بھی ملتا ہے، یہ مضمون ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب ہی کے نام نامی سے رسالہ'' تحقیق'' شمارہ ۱۱-۱۰، ۹۷-۱۹۹۶ء میں شائع ہوا ہے، اس کا عنوان'' نکات الشعراء سے متعلق چند یادداشتیں'' ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب کا تجویز و ترقیم کیا ہوا ہے۔

خط نمبر ۳: (۱) یہ مکتوب ڈاکٹر صاحب کے ذاتی لیٹر پیڈ پر مرقوم ہے، صرف ۲۱ رمئی درج ہے۔ (۲) ڈاکٹر صفیہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کی صاحب زادی، ۱۹۹۸ء میں'' اردو شاعری میں قرآنی تلمیحات'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کیا۔

خط نمبر۴: (۱) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی تصنیف ''سراج البیان'' میں یہ مضمون شامل ہے، فہرست سے پتا چلتا ہے کہ یہ مضمون اس سے قبل اپریل مئی ۱۹۶۸ء کے رسالہ ''نقوش'' لاہور میں طبع ہو چکا ہے، علاحدہ سے کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا۔

خط نمبر۵: (۱) اس رقعے کے زیریں حصے میں ڈاکٹر نجم الاسلام کے ہاتھ سے یہ عبارت قوسین میں درج ہے ''موصولہ ۵/نومبر ۱۹۹۷ء بہ نام نجم الاسلام''۔ (۲) یہ مضمون مع تصحیح ''تحقیق'' شمارہ (۱۱-۱۰) میں عام مقالات کے ذیل میں شائع ہوا ہے۔ (۳) یہ مضمون شمارہ ۱۱-۱۰ میں ''گوشۂ منسوبات'' میں نکلا ہے، اس میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے داخلی شواہد کی بنیاد پر یہ ثابت کیا کہ یہ دیوان حضرت عبدالقادر جیلانی ملقب ''محی الدین'' کا نہیں بلکہ ''محی لاری'' (م ۹۳۳ھ) کا ہے۔

خط نمبر۶: (۱) یہ مکتوب بھی سادے کاغذ پر لکھے گئے رقعے کی صورت میں ہے، اس مکتوب کے زیریں حصے میں بھی ڈاکٹر نجم الاسلام نے لکھا ہے'' موصولہ ۱۶/نومبر ۱۹۹۷ء بہ نام نجم الاسلام، تصحیح مطلوبہ کر لی گئی (انی شل)''۔ (۲) ''تحقیق'' شمارہ (۱۱-۱۰) میں یہ مضمون تصحیح شدہ عنوان ہی کے تحت شائع ہوا ہے۔

خط نمبر۷: (۱) ڈاکٹر صاحب ایک عرصے سے علمی و ادبی اور تحقیقی کاموں میں ہمہ وقت مصروف ہیں، گاہے بہ گاہے علمی و ادبی اور ثقافتی تقریبات میں بھی شرکت فرماتے ہیں، آپ کے تفصیلی حالات اور خدمات جلیلہ کے مطالعے کے لیے دیکھیے: رسالہ ''تحقیق'' شمارہ (۱۱-۱۰)، ''گوشۂ بلوچ'' شعبۂ اردو سندھ یونی ورسٹی، جام شورو۔

خط نمبر۸: (۱) مکتوب کے زیریں حصے میں ڈاکٹر نجم الاسلام نے قوسین میں یہ عبارت تحریر کی ہے: ''رقعہ موصولہ (؟) جولائی ۱۹۹۷ء...ڈاکٹر نجم الاسلام کسر نفسی کے باعث اپنے سوانحی حالات تحریر کرنے سے اجتناب کرتے تھے، کبھی کسی نے انٹرویو لینے کی کوشش کی تو اسے بھی کام یابی نہیں ہو سکی، بعض تقاضوں کے تحت بائیو ڈیٹا ضرور ترتیب دیے، میرے علم میں نہیں کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کا اس قسم کا کوئی مضمون ڈاکٹر نجم الاسلام کے متعلق شائع ہوا ہو، ۹۸-۱۹۹۷ء میں آنسہ نازنین سلیم نے ''ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے نام ور شاگردوں کی ادبی خدمات کا جائزہ'' کے عنوان سے مقالہ علمیہ برائے ایم-اے، شعبۂ اردو سندھ یونی ورسٹی میں تحریر کیا تھا، جس میں پہلی مرتبہ ڈاکٹر نجم الاسلام کے تفصیلی حالات زندگی سامنے آئے، اسی ضرورت کے تحت ڈاکٹر نجم الاسلام نے بعض معلومات انہیں بہ قلم خود تحریر کر کے دی تھیں۔

اخبار علمیہ

ہندوستان کے وزیر فروغ انسانی وسائل نے مئی ۲۰۰۶ء کے آخر میں سعودی عرب کا دورہ کیا اور شاہ عبداللہ اور ان کے کئی اہم وزرا سے ملے، سعودی وزیر تعلیم ڈاکٹر عبداللہ بن صالح عبید سے ان کی ملاقات اس اعتبار سے اہم ہے کہ انہوں نے سعودی عربیہ میں معیاری آئی سی ٹی مرکز اور اعلا تعلیمی ادارے قائم کرنے میں ہندوستان سے تعاون چاہا، ہندوستانی وزیر نے سعودی عربیہ میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکول کی شاخیں کھولنے کی تجویز بھی پیش کی، وہ امام محمد بن سعود اسلامی یونی ورسٹی بھی گئے اور اس کے مختلف شعبوں کی کارکردگی سے متاثر ہوئے، دوسری طرف خادم حرمین شریفین نے جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی میں لائبریری اور ریسرچ سنٹر کے قیام کے لیے تیس لاکھ ڈالر کا خطیر عطیہ دیا، وہ اس سال جب جنوری میں ہندوستان تشریف لائے تھے تو جامعہ نے انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا تھا۔

NATFHE (نیشنل ایسوسی ایشن آف ٹیچرس ان فردر اینڈ ہایر ایجوکیشن) برطانیہ کے کالجوں کے اساتذہ کی سب سے بڑی یونین ہے جس کے ارکان کی تعداد ۶۷ ہزار ہے، جلد ہی یونین کی سالانہ تقریب ہونے والی ہے، جس میں فلسطینیوں کے تئیں اسرائیل کی جارحانہ اور نسل کشی کی پالیسی کے خلاف یونین کے ارکان اسرائیلی اشیا کا بائیکاٹ کرنے پر غور کریں گے، یونین سے وابستہ ماہرین تعلیم نے کہا ہے کہ چوں کہ اسرائیل فلسطینیوں کی نسل کشی اور وہاں حقوق انسانی کی پامالی کی پالیسی پر مسلسل عمل پیرا ہے اور اسرائیل اور مغربی کنارہ کے درمیان دیوار کی تعمیر اس کی اسی ناپاک سازش کا ایک حصہ ہے، اس لیے کانفرنس میں اسرائیلی اشیا کے بائیکاٹ کی تجویز بہ طور خاص موضوع بحث ہوگی۔

طویل عرصے سے شام پر ملحد اور خدا بیزار حکم رانی کا تسلط ہے، جنہوں نے وہاں کے مذہبی فکر والوں کا عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے اور وہ عوام کے دلوں سے دینی جذبات و خیالات

ختم کردینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے لیکن ادھر اس طرح کی خوش آیند خبریں آرہی ہیں کہ نوجوانوں میں دین سے رغبت پیدا ہورہی ہے، جمعہ کے دن مساجد بھر جاتی ہیں، خواتین میں دینی اور مذہبی علوم سے شغف بڑھ رہا ہے، وہ دینی اداروں کے لکچرز میں بڑی تعداد میں شریک ہوتی ہیں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں پردے کا اہتمام کرتی ہیں اور اکثر ریسٹورنس میں مے نوشی پر پابندی عائد کی جارہی ہے، مذہب بے زار اور غیر دینی لٹریچر کے مقابلے دینی و مذہبی کتابوں کی مانگ بڑھ گئی ہے، عام شاہ راہوں پر ایسے بینر نظر آتے ہیں جن پر قرآنی آیات اور احادیث شریفہ لکھی ہوتی ہیں۔

اسرائیل کے روزنامہ "Haaretz" کی اطلاع ہے کہ وہاں کے دانش وروں اور تعلیم یافتہ لوگوں کے ایک گروہ نے مطالبہ کیا ہے کہ یہودی نوآبادکاروں کے حملے سے فلسطینی بچوں کو محفوظ رکھنا چاہیے، اس نے اسرائیلی وزیر اعظم یہود والمرٹ کے نام اپنے ایک کھلے خط میں لکھا ہے کہ فوجی دستوں کے لیے یہ بات نہایت نازیبا اور موجب شرم ہے کہ حملہ آور بچوں اور کم زوروں کو نشانہ بنائیں، یہاں تک کہ ابتدائی اسکولوں کے طلبہ بھی اس کی لپیٹ میں آرہے ہیں۔

چین کے سائنس دانوں نے مچھلی کی شکل کا روبوٹ تیار کیا ہے جس میں وہی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو مچھلی میں ہوتی ہیں، اس میں ایک موٹر لگا ہوا ہے جو بالکل مچھلی کی طرح ڈوبتا اور سطح آب پر تیرتا ہے، اس کے اعضا بھی ہو بہو مچھلی کی طرح حرکت کرتے ہیں، "دی اسٹیٹس ٹائمس" میگزین کو انٹرویو کے درمیان چیانگ گو نے اپنی اس کامیابی کے زعم میں یہ بکواس بھی کی ہے کہ قدرت کو اپنی کائنات کی تخلیق و تزئین میں لاکھوں کروڑوں برس کا عرصہ لگا ہوگا، ہم لوگ قدرتی تخلیقات کی ہو بہو نقل تو نہیں کر سکتے تاہم ہم نے بھی ایک اچھا کام انجام دیا ہے، ہم کو ان روبوٹوں کی تیاری میں دو سال لگ گئے، ان میں جو متعدد قسم کے آلات لگے ہیں وہ مچھلیوں کے اعضا جیسے ہیں، سائنس دانوں کا بیان ہے کہ اس روبوٹ میں سمندری اور آبی پروجیکٹوں کو پورا کرنے کی پوری صلاحیت بھی ہے۔

"الاقتصادیہ" کی خبر ہے کہ شاہ سعود یونی ورسٹی کی مجلس علمی کی منظور شدہ قرارداد کے مطابق شاہ فہد قومی لائبریری کے زیر نگرانی "جمیعة المکتبات والمعلومات السعودیہ" کے نام سے ایک الکٹرانک لائبریری قائم کی گئی ہے، اس کے عارضی دفتر میں بنیادی ضرورتوں کے تمام سامان فراہم کردیے گئے ہیں، انٹرنیٹ پر اس کا ویب سائٹ بھی کھولا گیا ہے، ریاض کے گورنر شہزادہ سلمان بن عبدالعزیز اس کے اعزازی صدر منتخب کیے گئے ہیں، اس کے اغراض و مقاصد میں فکری و علمی میدانوں میں کام کرنے والوں کو ترقی کے مواقع فراہم کرنا، پورے مسلم معاشرے کو لائبریری سے جوڑنا اور اس سے جڑنے کے لیے مواقع اور سہولتیں بہم پہنچانا وغیرہ ہیں تاکہ لوگوں میں کتب بینی اور تحقیق و تدقیق کا ذوق اور حالات و زمانہ شناسی کا رجحان بے دار ہو۔

انسان کے ارتقائی مراحل کے متعلق "نیچر" میں خبر شائع ہوئی ہے کہ موجودہ انسان اور چمپنزی نے لمبے عرصے تک ساتھ ساتھ زندگی گزاری ہے اور ان میں ۶۳ لاکھ سال پہلے علاحدگی ہوئی، اس سے سائنس دانوں کے اس خیال کو تقویت ملی ہے کہ بنی نوع آدم پہلے چمپنزیوں کی برادری سے تعلق رکھتے تھے، براڈ انسٹی ٹیوٹ آف ایم آئی ٹی اور ہارورڈ میڈیکل اسکول کے سائنس دانوں کی اس تجزیاتی رپورٹ کی خصوصی اہمیت کے پیش نظر اس کی تفصیلی رپورٹ "واشنگٹن پوسٹ" میں بھی آئی ہے، ان کے خیال کے مطابق لاکھوں برس پہلے علاحدگی کے باوجود ان میں اب بھی بعض قدر مشترک پایا جاتا ہے، رپورٹ میں نہ صرف انسانوں کے ارتقائی مراحل کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ دوسری نسلوں کے ارتقا پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان کے الگ ہونے کے اسباب و علل کا مسئلہ اب بھی لاینحل اور معمہ بنا ہوا ہے، جس پر غور و فکر کا سلسلہ جاری ہے، ان کے بیان کے مطابق بلاشبہ چمپنزی اور نسل آدم کے بعض خاندانی و نسلی خصائص میں بہت حد تک مشابہت پائی جاتی ہے، انہوں نے چمپنزی، گوریلا اور آدمیوں کے جینوں پر تجربہ و تحقیق کی ہے جس میں انہیں دونوں کے X کروموزوم میں کافی حد تک مماثلت نظر آئی۔

ک ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

رشید حسن خاں کی یاد میں

۱

مبارک اردو لائبریری،
محمد آباد، تحصیل صادق آباد،
پاکستان۔
۱۵/ مئی ۲۰۰۶ء

محترم امجد جاوید صاحب (انگلینڈ) کے زر سالانہ ادا کرنے پر "معارف" ہمارے نام جاری ہوا ہے، اپریل کا شمارہ آ پہنچا ہے، آپ کا شکریہ، شمس بدایونی صاحب نے رشید حسن خاں کو بڑی محبت سے یاد کیا ہے، صفحہ ۳۱۴ پر اکیلا "دوران" استعمال کیا ہے، انہوں نے حالاں کہ دوران کے بعد "میں" (۱) ضروری ہے، آگے چل کر لکھتے ہیں "چلتے وقت تین کتابیں نذر کیں" عطا کیں لکھنا چاہیے تھا، "تکان نہیں ہوتا" "لغت دیکھنا پڑے گی، ہوتا لکھنا چاہیے یا ہوتی (۲)، اس وقت وقت کی کمی ہے، مجھے "غالب مدح و قدح کی روشنی میں" کا طبع اول کا نسخہ چاہیے، میری مدد کیجیے، ہمارے ہاں "معارف" شمارہ اول سے محفوظ چلا آیا تقسیم ہند تک۔

سید انیس شاہ جیلانی

۲

کاشانۂ ادب، سکلا دیو راج،
پوسٹ بسوریا وایا لوریا،
مغربی چمپارن بہار۔
۴/۵/۲۰۰۶ء

باسمہ

مخدوم گرامی قدر، السلام علیکم و رحمۃ اللہ

امید ہے آپ ہر طرح خیریت سے ہوں گے۔

بالغ نظر محقق و دانشور جناب رشید حسن خاں کی وفات کی خبر سن کر بڑا افسوس ہوا، رشید حسن

(۱) دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، یہاں "میں" کا موقع تھا مگر دوران تحقیقات اور دوران مقدمہ وغیرہ میں "میں" ضروری نہیں ہے۔ (۲) جی ہاں "ہوتی" درست ہے۔

خاں صاحب نے شاہ جہاں پور کے مشہور و معروف مدرسہ بحر العلوم میں تعلیم حاصل کی تھی لیکن اپنی محنت و ریاضت اور مطالعے سے علم و ادب اور تحقیق کی دنیا میں وہ مقام حاصل کر لیا تھا کہ شاید و باید۔

رشید حسن خاں نے جہاں سودا، ناسخ، نظیر اکبر آبادی کے کلام اور میر انیس و دبیر کے مراثی کا انتخاب شائع کیا وہاں دیوان درد، کلیات جعفر زٹلی، مثنوی سحر البیان، مثنوی گل زار نسیم اور مثنویات شوق (مرزا شوق لکھنوی) کو اپنے گراں قدر مقدموں کے ساتھ شائع کر کے "شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد" کے مفروضے کو انہوں نے غلط ثابت کر دیا۔

رشید حسن خاں نے ایک طرف انشائے غالب، املائے غالب، باغ و بہار، فسانۂ عجائب، مقدمہ شعر و شاعری، حیات سعدی، موازنہ انیس و دبیر، مصطلحات ٹھگی اور کلاسکی ادب کی فرہنگ کی ترتیب و تدوین کی تو دوسری طرف انہوں نے انشاء اور تلفظ، اردو املا، اردو زبان اور قواعد، تلاش و تعبیر اور تفہیم جیسی علمی و تحقیقی کتابیں تصنیف کر کے علم و ادب اور تحقیق کی دنیا میں اپنی علمی، ادبی، لسانی، تنقیدی اور تحقیقی بصیرت و آگہی کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

مولانا ماہر القادری مرحوم نے مرحوم کی تصنیف "زبان اور قواعد" پر تبصرہ کرتے ہوئے انہیں اردو لسانیات کا بادشاہ قرار دیا ہے۔

ان کی تصنیفات ان کی وسعت مطالعہ، گہری بصیرت اور تحقیق و تدقیق میں حقیقت پسندی کی شاہد ہیں، وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے، ایک بار آرزو صاحب نے فرمایا:

> "رشید حسن خاں صاحب شاہ جہاں پور کے پٹھان ہیں، تحقیق و تنقید میں وہ کسی کی رو رعایت نہیں کرتے، ایک بار ایک علمی مجلس میں مالک رام کی کچھ تحقیقی فروگزاشتوں پر اتنے سخت لب و لہجہ میں تنقید کی کہ مالک رام میں اضطرابی کیفیت پیدا ہو گئی، مالک کو Angina کی دوا دی گئی تب جا کر ان کی طبیعت سنبھل سکی"۔

رشید حسن خاں مرحوم نے "موازنہ انیس و دبیر" کی ترتیب و تدوین کے علاوہ علامہ شبلی نعمانیؒ کے مضامین کا انتخاب شائع کر کے "دبستان شبلی" کے ساتھ اپنی علمی وابستگی کا ثبوت پیش کیا ہے، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

والسلام وارث ریاضی

مطبوعات جدیدہ

الاشباہ والنظائر فی القرآن الکریم: از ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی مرحوم، قدرے بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۶۱۲، قیمت: ۳۵۰ روپے، پتہ: شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ (رجسٹرڈ) N-80/C، ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی-۲۵۔

لغات القرآن کے موضوع پر عربی اور اردو میں خاصا عمدہ ذخیرہ ہے، غرائب، مشکلات، مفردات کے عنوان سے علوم القرآن میں یہ موضوع ہمیشہ محققین علما کی توجہ کا مرکز رہا، ان میں مقاتل بن سلیمان الازدی اور ان کی کتاب الاشباہ والنظائر سرفہرست ہیں، کتاب الاشباہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ایسے الفاظ وکلمات پر مشتمل ہے جو قرآن مجید میں متعدد بار اور سیاق کلام سے متعدد مفہوم میں آئے ہیں، مثلاً اخذ یعنی قبول، پذیرائی، بند کرنا پکڑنا، روکنا، عذاب، سزا، قتل، قید وغیرہ، اس طرح مختلف آیتوں میں اس لفظ کے استعمال اور مفہوم کی نشان دہی کی گئی ہے، قریب ۱۶۸-الفاظ کی یہ لغت، دوسری صدی ہجری میں مرتب کی گئی، یہ قابل قدر نسخہ کم یاب تھا، حیدرآباد دکن کے نامور محقق اور صاحب نظر اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے الفاظ میں ہندوستان کی قیمتی متاع ڈاکٹر ابوالنصر خالدی مرحوم نے اس کو حاصل کیا، ترجمہ کیا اور تشریح، توضیح، یادداشت اور انتباہ کی ذیلی سرخیوں سے امام مقاتل کے اجمال کی تفصیل بھی بڑی خوبی سے کردی، افسوس یہ ہے کہ فاضل مترجم ومحشی کا مقدمہ نہیں ہے لیکن لائق ناشر مولانا عطاء الرحمن قاسمی نے اس کمی کی خوبی سے تلافی کردی، الفبائی ترتیب غالباً ان کی ہے کیوں کہ اصل میں یہ ترتیب نہیں تھی، آیتوں کے ترجمہ کے لیے مولانا محمود حسن دیوبندی اور تشریح کے لیے حضرت شیخ الہند کے علاوہ مولانا فتح محمد جالندھری، مولانا آزاد اور مولانا مودودی کی تفسیروں کو بھی مدنظر رکھا

گیا ہے، اس طرح قدیم وجدید مختلف اسلوبوں کی وجہ سے یہ علوم القرآن کے شائقین کے لیے اور زیادہ مفید اور جاذب ہوگئی ہے، اس اہم کتاب کی اشاعت کے لیے ڈاکٹر خالدی مرحوم کے لائق فرزند ڈاکٹر محمد عمر خالدی اور شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی دونوں لائق تحسین وتبریک ہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، عہد ساز شخصیت، مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں:

از مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۳۶۰، قیمت: ۱۲۰ روپے، پتہ: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹، ندوۃ العلما لکھنؤ۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی سیرت وشخصیت پر ان کی وفات کے بعد ہی سے کتابوں، مضامین کے مجموعوں اور رسالوں کے خاص نمبروں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے اور یہ ان کی ہمہ جہت وہمہ گیر شخصیت کا فطری نتیجہ واثر ہے، مولانائے مرحوم کی خودنوشت کاروان زندگی بہ ظاہر کافی تھی لیکن مولانا کے افکار ونظریات، تعلیم، تدریس، تصنیف وتالیف، اصلاحی وتبلیغی مساعی کا دائرہ اس درجہ وسیع اور متنوع ہے کہ ہر کتاب اور ہر مضمون کے بعد بھی کسی نئے گوشے اور نئے پہلو کی اہمیت کم نہیں ہوتی، زیر نظر کتاب بھی اسی ضمن میں ہے اور اس کی اہمیت اس لیے بھی سوا ہے کہ مولانائے مرحوم کے عزیز قریب کے قلم ہی سے نہیں، ان کے سب سے زیادہ معتمد، مشیر، معاون اور رفیق کار کے مشاہدات وتجربات پر مشتمل ہے، اس لیے یہ کہنا بالکل درست اور بجا ہے کہ اس کتاب کی حیثیت وثیقہ اور دستاویز کی ہے، فکر کے مقابلہ میں تجربہ اور مطالعہ کے مقابلہ میں مشاہدہ کی اہمیت بہرحال ہے، مختلف ابواب میں مولانا کے حالات کے مختصر جائزے کے بعد تعلیم وتربیت، عملی زندگی، تحریکیں اور ادارے، دعوتی اسفار اور تصنیفات پر بڑی خوبی سے اظہار خیال کیا گیا ہے، قدرتاً تحریکوں والا باب زیادہ مفصل ہے جس میں مجلس تحقیقات، رابطہ ادب اسلامی، پیام انسانیت، دینی تعلیمی کونسل، مسلم مجلس مشاورت اور مسلم پرسنل لا بورڈ اور خود

ندوۃ العلما کا ذکر ہے، مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذکر میں بابری مسجد کا بھی ذکر ہے جس میں فاضل مصنف کی یہ عینی شہادت ہے کہ مولانا کا اصرار تھا کہ حکومت جلدی کرے اور قانون اور حکومتی ذرائع سے مسجد کی حفاظت یقینی بنائے، یہ بھی ذکر ہے کہ مولانا نے بورڈ کے صدر ہونے کی حیثیت سے اپنے لیے کوئی انفرادی رائے اختیار نہیں کی بلکہ بورڈ کی اجتماعی قیادت کے اختیار میں رہنے دیا، مسلمانوں کے ملی حقوق اور مقاصد کے حصول میں مولانائے مرحوم کا نقطہ نظر یہی رہا کہ مسئلہ کو مناسب ڈھنگ سے سمجھایا جائے اور قانون اور دستور کے دائرے میں رہ کر جو بھی ممکن وسائل ہوں ان کو اختیار کیا جائے، اس سلسلہ میں ائمہ مساجد کی تنخواہوں کا معاملہ بھی ہے کہ حکومت سے ان تنخواہوں کی درخواست پر مولانائے مرحوم نے سخت نکیر کرتے ہوئے فرمایا کہ بورڈ سے تعلق ہوتے ہوئے میں اس کو نہیں ہونے دے سکتا، وجہ صرف یہی تھی کہ وہ شخصی ضرورت اور مادی منفعت طلب کرنے کو مضر سمجھتے تھے، یہ کتاب صرف مولانا ندویؒ کے مزاج اور طریق کار کو سمجھنے کے لیے ہی نہیں، آزادی کے بعد کے ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل اور ان کے حل کی راہ میں بھی بہت مفید ہے، فاضل مصنف کے اسلوب کی سادگی اور بے ساختگی نے بھی اس کو پراثر اور ممتاز بنادیا ہے۔

جنگ آزادی، شخصیات، نظریات وتحریکات: از درخشاں تاجور، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۸۰، قیمت: ۱۵۰ روپے، پتہ: امین اینڈ سنس، بخشی پور، گورکھ پور اور دانش محل امین آباد، لکھنؤ وغیرہ۔

ٹیپو سلطان، حسرت موہانی، مولانا جوہر، اشفاق اللہ، بسمل، لاجپت رائے اور ایک نسبتاً گم نام مجاہد آزادی نواب خان بہادر اور ریشمی رومال وغیرہ جیسی شخصیتوں اور تحریکوں پر مشتمل مضامین کا یہ مجموعہ، لائق مصنفہ کے جذبہ وشوق کا نتیجہ ہے، ان کے مطالعہ وجستجو کا مقصد یہی ہے کہ ہندوستان کی تحریک آزادی اور سامراجی انگریزی قبضہ وتسلط کے خلاف قربانی دینے والوں کو

خراج تحسین اس لیے پیش کیا جائے کہ موجودہ صورت حال کی محسن فراموش تاریکی کسی نہ کسی درجے دور ہو، وطن پرستی وحریت پسندی کے جذبات کو تقویت دینے والی یہ تحریریں گو مختصر ہیں لیکن اپنے موضوع پر ضروری معلومات سے خالی نہیں، آزادی وطن اور شعرائے اترپردیش اور مولانا آزاد اور پریم چند کے حوالے سے جدوجہد آزادی کے بارے میں مفید معلومات ہیں، مصنفہ کا خاص موضوع تحریک آزادی ہے، ان کی تین کتابیں اسی سے متعلق ہیں، اس لیے معتبر و مستند مآخذ بھی ان کی دست رس سے دور نہیں، توقع ہے کہ یہ کتاب مقبول ہوگی۔

ثنا: از جناب نثار جے راج پوری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۱۴۴، قیمت: ۶۰ روپے، پتہ: ۶۷- جالندھری، اعظم گڈھ۔

نثار جے راج پوری، اردو کے جدید ذہن اور لب ولہجے کے شاعر ہیں، ان کے شعر اب اردو رسائل کی مستقل زینت ہیں، اس سے پہلے دست رس اور صدائے شکست دل کے ناموں سے ان کی غزلوں اور نظموں کے دو مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں، زیر نظر مجموعہ صرف حمدیہ اشعار کے لیے خاص کیا گیا ہے، شاعر نے پہلے بھی بار بار اس حقیقت کا اظہار کیا تھا کہ

یہ سوچ مری اور یہ افکار اسی کے
ہیں مجھ میں سموئے سبھی پندار اسی کے
یہ پھول یہ غنچے، یہ ہوا اور یہ تتلی
ہیں چارسو اشجار ثمر بار اسی کے

اس مجموعہ کو پیش کرتے ہوئے انہوں نے صاف کہا کہ حمد نگاری کو انہوں نے محض روایت کے طور پر نہیں، جاگتی آنکھوں، کھلے ذہن اور لطیف ترین جذبات کے ساتھ اپنایا ہے، شاعر، جدید ضرور ہیں لیکن ان کی فکر میں انحراف نہیں، شاعری ان کے نزدیک محض تفریح طبع اور تسکین ذوق کا سامان نہیں، یہ مجموعہ واقعی نگار خانہ فطرت کا حسین مشاہدہ ہے، آسان زبان اور لہجے کی جدت نے ہر حمد کو پرکیف وپراثر بنادیا ہے، پاکیزہ شاعری کے قدر دانوں کے لیے یہ مجموعہ

ایک عمدہ تحفہ ہے۔

ادائے اظہار کی تمنا: از ڈاکٹر حمید نسیم رفیع آبادی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۷۴، قیمت: ۲۵۰ روپے، پتہ: آمنہ صائم پبلی کیشنز، لیجن، سری نگر، کشمیر۔

کشمیر کے خوش طبع شاعر کی خوش گوئی کا یہ نمونہ قابل ستائش ہے، کشمیر کی نوجوان نسل دراصل تربیت گاہ غم کی پیداوار ہے، نوجوان شاعر کی شاعری میں زخمی انسانی جذبات کا اظہار اگر شدت سے نظر آتا ہے تو یہ اس کی شاعری کی صداقت کا ثبوت ہے، اس کا خود یہ اقرار حق بجانب ہے کہ درد والم کے مناظر کی بھرمار نے شاعرانہ حسیت کو بڑا متاثر کیا ہے، شاید اسی لیے وہ کہہ اٹھتا ہے کہ

فرق آب و سراب کون کرے
آب بھی ہے سراب کے مانند

اور یہ کہ

میرا حال زار بھی دیکھ
ظالم کا پندار بھی دیکھ

غزلوں اور نظموں کے اس معیاری مجموعے کی شروعات حمد و نعت سے ہوتی ہے، کتاب کا عنوان بھی نعت کے ایک مصرعہ سے ماخوذ ہے اور اس انتخاب کے لیے یہ کہنا شاعر کی سلامت طبع کی دلیل ہے کہ "ہر مسلمان شاعر...... کا وظیفہ حیات ہی اس ادائے اظہار کی صلاحیت حاصل کرنا ہے تاکہ وہ اپنے عظیم پیغمبر محسن انسانیت ﷺ کی خدمت اقدس میں پیش کرنے کے لائق نعت لکھنے کے قابل ہو سکے"۔

ع ۔ ص

تصانیف مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

۱۔ **اسوۂ صحابہ (حصہ اول):** اس میں صحابہ کرامؓ کے عقائد، عبادات و اخلاق و معاشرت کی تصویر پیش کی گئی ہے قیمت: ۷۰ روپے

۲۔ **اسوۂ صحابہ (حصہ دوم):** اس میں صحابہ کرامؓ کے سیاسی، انتظامی اور علمی کارناموں کی تفصیل دی گئی ہے۔ قیمت: ۸۰ روپے

۳۔ **اسوۂ صحابیاتؓ:** اس میں صحابیاتؓ کے مذہبی، اخلاقی اور علمی کارناموں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ قیمت: ۲۴ روپے

۴۔ **سیرت عمر بن عبدالعزیز:** اس میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مفصل سوانح اور ان کے تجدیدی کارناموں کا ذکر ہے۔ قیمت: ۶۰ روپے

۵۔ **امام رازیؒ:** امام فخر الدین رازیؒ کے حالات زندگی اور ان کے نظریات و خیالات کی مفصل تشریح کی گئی ہے۔ قیمت: ۹۰ روپے

۶۔ **حکمائے اسلام (حصہ اول):** اس میں یونانی فلسفہ کے مآخذ، مسلمانوں میں علوم عقلیہ کی اشاعت اور پانچویں صدی تک کے اکابر حکمائے اسلام کے حالات، علمی خدمات اور فلسفیانہ نظریات کی تفصیل ہے۔ قیمت: ۱۵۰ روپے

۷۔ **حکمائے اسلام (حصہ دوم):** متوسطین و متاخرین حکمائے اسلام کے حالات پر مشتمل ہے قیمت: ۴۰ روپے

۸۔ **شعر الہند (حصہ اول):** قدما سے دور جدید تک کی اردو شاعری کے تغیر کی تفصیل اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ قیمت: ۸۰ روپے

۹۔ **شعر الہند (حصہ دوم):** اردو شاعری کی تمام اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے۔ قیمت: ۷۵ روپے

۱۰۔ **تاریخ فقہ اسلامی:** تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات ذکر کی گئی ہیں۔ قیمت: ۱۲۵ روپے

۱۱۔ **انقلاب الامم:** سر تطور الامم کا انشا پردازانہ ترجمہ قیمت: ۵۵ روپے

۱۲۔ **مقالات عبدالسلام:** مولانا مرحوم کے ادبی و تنقیدی مضامین کا ترجمہ قیمت: ۶۰ روپے

۱۳۔ **اقبال کامل:** ڈاکٹر اقبال کی مفصل سوانح اور ان کے فلسفیانہ و شاعرانہ کارناموں کی تفصیل کی گئی ہے۔ قیمت: ۷۵ روپے